وحدتِ اُمّت

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ

مکتبہ خدام القرآن لاہور

وحدتِ اُمّت

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ

مکتبہ خُدّام القرآن لاھور

36 کے ماڈل ٹاؤن لاہور فون: 5869501-3

نام کتاب ——— وحدتِ اُمت

تالیف ——— مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ

تاریخ اشاعت ——— اپریل 2008ء

تعداد اشاعت ——— 2200

ناشر ——— ناظم نشر و اشاعت، مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مقامِ اشاعت ——— 36۔ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور

فون: 3-5869501

مطبع ——— شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور

قیمت ——— 25 روپے

email:publications@tanzeem.org
website:www.tanzeem.org

تقدیم

نحمدہٗ ونصلی علٰی رسولہ الکریم

مفتیٔ پاکستان مولانا مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ ونور مرقدہٗ کا نامِ نامی اسمِ گرامی محتاجِ تعارف نہیں ہے۔ مفتی صاحب مرحوم اپنے علم وفضل، اپنے تقویٰ اور اپنی بالغ نظری و وسعتِ قلبی کی وجہ سے اہل علم کے تمام مکاتیب فکر میں محترم ومکرم تو تھے ہی، عامۃ الناس میں بھی نہایت ہر دل عزیز اور محبوب تھے۔

مولانا مرحوم کو اللہ تعالیٰ نے تفقہ فی الدین سے مالا مال فرمایا تھا اور ان کے قلب میں اہل سنت کے تمام فقہی مسالک کے متعلق بڑی اعلیٰ ظرفی عطا فرمائی تھی، اور مرحوم زبان وقلم سے کوشاں رہے کہ مسلمانوں کی صلاحیتیں اور توانائیاں آپس کے فقہی و فروعی اختلافات میں ضائع ہونے کے بجائے وحدتِ اُمت کے تصور کو مستحکم کرنے میں صَرف ہوں۔ اختلافات جائز حدود تک رہیں، وہ کسی طور پر بھی مخالفت کی صورت اختیار نہ کریں۔

مولانا مرحوم کو اس امر کا شدت سے احساس تھا کہ اختلاف رائے جب مخالفت کی صورت اختیار کر لیتا ہے تو وحدتِ اُمت کو شدید صدمہ پہنچتا ہے اور یہ افتراق دنیا میں پوری اُمت کے ذلیل وخوار ہونے کا باعث بنتا ہے۔ مولانا مرحوم پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام ونفاذ میں اہل سنت کے مختلف مکاتیب فکر کی مخالفتوں پر انتہائی کڑھتے تھے۔ ان کی پختہ رائے تھی کہ وحدتِ اُمت کی جتنی ضرورت پاکستان کے اہل سنت کو ہے،

شاید کسی دوسرے مسلم ملک کو اتنی نہ ہو۔

مولانا مرحوم نے قریباً چودہ سال قبل لائل پور (حال فیصل آباد) میں ملک کی ایک مشہور سلفی المسلک (اہل حدیث) جامعہ میں ''وحدتِ اُمت'' کے موضوع پر بڑی دلسوزی کے ساتھ اظہارِ خیال فرمایا تھا۔ ازاں بعد اسی موضوع پر ایک مرتبہ اور بھی تقریر کی تھی۔

یہ دونوں تقاریر پہلے مکتبہ المنبر فیصل آباد نے' بعدہٗ دارالاشاعت کراچی نے شائع کیں۔ ان تقاریر کے اہم اقتباسات انجمن خدامِ اسلام ٹاؤن شپ' لاہور نے ہزاروں کی تعداد میں شائع کر کے مسلمانوں تک پہنچائے اور اب بھی پہنچا رہی ہے۔

اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ کی کتاب ''وحدتِ اُمت'' کو وسیع پیمانے پر عوام و خواص' بالخصوص اہلِ علم کے حلقے تک ایک مہم کے طور پر پہنچانے کا اہتمام کیا جائے۔ اسی مقصد کے پیشِ نظر مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور اس مفید کتاب کا پہلا ایڈیشن شائع کر رہی ہے۔

(ڈاکٹر) اسرار احمد عفی عنہ

جمادی الاولیٰ ۱۴۰۵ھ / فروری ۱۹۸۵ء

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

میرے بزرگو اور دوستو! یہ امر ایک حقیقت ہے، اس میں کسی تواضع کا دخل نہیں کہ ابتداءِ عمر سے نہ کبھی کوئی خطیب رہا نہ واعظ اور نہ بڑے مجمعوں کو خطاب کرنے کا عادی۔ میری پوری عمر پڑھنے پڑھانے میں گزری یا پھر کچھ کاغذ کالے کرنے میں۔ عام مسلمانوں کی ضرورت کے مطابق مختلف رسائل پر تصنیف کا سلسلہ رہا اور میرے بزرگوں نے اپنے حسنِ ظن سے خدمتِ فتویٰ میرے سپرد فرمادی۔ عمر کا ایک بہت بڑا حصہ اس میں صَرف ہوا۔

ہمارے محترم حکیم عبدالرشید اشرف صاحب نے اپنے حسنِ ظن اور کرم فرمائی سے مجھے یہاں لا بٹھایا اور جو عنوان مجھے کلام کرنے کے لیے حوالہ فرمایا، وہ جس طرح اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایسا یقینی اور واضح ہے کہ اس میں دو رائے ہونے کی کوئی گنجائش نہیں۔ اسی طرح ہمارے معاشرے میں اس کا وجود ایسا کمیاب ہے کہ اپنے معاشرہ کو سامنے رکھتے ہوئے اس موضوع پر زبان کھولنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ مجھے عنوان یہ دیا گیا ہے کہ اُمت اسلامیہ ایک ناقابل تقسیم وحدت ہے۔ یہ بات اپنی جگہ بالکل صحیح اور ناقابل انکار حقیقت ضرور ہے، مگر ہمارے حالات وواقعات دنیا کو اس کے خلاف یہ دکھلا رہے ہیں کہ یہ اُمت ایک ناقابل اجتماع تشتت ہے۔ اپنے حالات وخصوصیاتِ وقت سے صرفِ نظر کر کے مسئلہ کے دلائل پر بحث ایک نرا فلسفہ ہے جس سے ہماری کوئی ضرورت پوری نہیں ہوتی۔ اس لیے مجھے اس مسئلہ کے مثبت پہلو پر کچھ کلام کرنے سے زیادہ اس کے منفی پہلو افتراق وتشتت اور اس کے اسباب پر غور اور اس کے علاج کی فکر کرنا ہے۔

جہاں تک اسلام کی دعوتِ اتحاد اور تمام دنیا کے مسلمانوں کو بلکہ کل انسانوں کو ایک قوم ایک خاندان اور ایک برادری قرار دینے کا معاملہ ہے وہ کوئی ایسی چیز نہیں جو کسی مسلمان پر مخفی ہو۔ قرآن کریم کے واضح الفاظ: ﴿خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ﴾ میں تمام بنی نوع اور بنی آدم انسان کو ﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ﴾ میں مسلمانوں کو ایک برادری قرار دیا گیا۔

حجۃ الوداع

حجۃ الوداع کے آخری خطبہ میں رسول کریم ﷺ نے جو اس وقت کے مسلمانوں کے سب سے بڑے اجتماع میں ہدایتی اصول ارشاد فرمائے ان میں اس بات کو بڑی اہمیت سے ذکر فرمایا کہ:

> ''اسلام میں کالے گورے، عربی عجمی وغیرہ کا کوئی امتیاز نہیں۔ سب ایک ماں باپ سے پیدا ہونے والے افراد ہیں''۔

اس ارشاد کے ذریعے جاہلانہ وحدتیں جو نسب اور خاندان کی بنیاد پر یا وطن اور رنگ اور زبان کی بنیاد پر لوگوں نے قائم کر لی تھیں ان سب کے بتوں کو توڑ کر صرف خدا پرستی اور دین کی وحدت کو قائم فرمایا۔

یہی وہ حقیقی وحدت ہے جو مشرق و مغرب کے تمام بنی آدم اور نوع انسان کے تمام افراد کو متحد کر کے ایک قوم اور ایک برادری بنا سکتی ہے اور سعی و عمل کے ذریعہ حاصل کی جا سکتی ہے۔ نسب اور وطن یا رنگ اور زبان کی بنیاد پر جو وحدتیں اہل جاہلیت نے قائم کر لی تھیں اور آج کی مزعومہ روشن خیالی کے دور میں پھر انہی کی پرستش کی جا رہی ہے ان وحدتوں کی بنیاد پر ہی انسانوں کے طبقات میں تفرقہ ہے اور تفرقہ بھی ایسا جس کو کسی عمل اور کوشش سے مٹایا نہیں جا سکتا۔ جو کالا ہے وہ گورا نہیں بن سکتا، جو نسب میں سید یا شیخ نہیں وہ کسی سعی و عمل سے شیخ یا سید نہیں بن سکتا۔

اسلام نے ایک ایسی وحدت کی طرف دعوت دی جس میں تمام انسانی افراد بلا کسی مشقت کے شریک ہو سکتے ہیں، اور یہ وحدت چونکہ ایک مالک حقیقی وحدہٗ لاشریک لہٗ کے

تعلق اور اس کی اشاعت سے وابستہ ہے' اس لیے بلاشبہ ناقابل تقسیم ہے۔

جو عنوان اس مجلس میں مجھے دیا گیا ہے اس کے مثبت پہلو پر تو اتنی گزارش بھی کافی سمجھتا ہوں۔ مگر اب یہ دیکھتا ہوں کہ یہ ایک عقیدہ اور نظریہ ہے جو زبانوں پر جاری اور کتابوں میں لکھا ہوا ہے' لیکن جب اپنے گردوپیش ہی نہیں' بلکہ مشرق و مغرب کے انسانوں کے حالات کا جائزہ لیا جائے تو اس کے برعکس یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ یہ ملت ایک تفرقہ ہے' جس میں اجتماع کا امکان دُور دُور نہیں۔ وہ ملت جس نے دنیا کے تمام انسانوں کو ایک خدا کی اطاعت پر جمع کر کے ایک برادری بنانے کی دعوت دی تھی:

﴿يَآأَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ﴾ (النساء:۱)

اور پھر مسلسل دعوت اور افہام و تفہیم کے باوجود لوگ اس برادری سے کٹ گئے' ان کو ایک جداگانہ قوم قرار دے کر خدا تعالیٰ کے ماننے والوں کو حسبِ دستور ایک قوم' ایک ملت اور ایک برادری بنا کر بنیانِ مرصوص' سیسہ پلائی ہوئی ناقابلِ شکست دیوار بنایا تھا' آج وہ ملت ہی طرح طرح کے تفرقوں میں مبتلا' ایک دوسرے سے بیزار اور برسرِ پیکار نظر آتی ہے۔ اس میں سیاسی پارٹیوں کے جھگڑے' نسبی برادریوں کی تفریق' پیشوں اور کاروبار کی تقسیم اور امیر غریب کا تفرقہ تو بنیادِ منافرت تھی ہی' زیادہ افسوس اس کا ہے کہ دین اور خدا پرستی غیروں کو اپنا بنانے اور نسبی' نسلی' وطنی اور لسانی تفرقوں کو مٹانے ہی کا نسخۂ اکسیر تھا' آج وہ بھی ہمارے لیے جنگ و جدل' عداوتوں اور جھگڑوں کا ذریعہ بن گیا' جس نے پوری ملت کو دینی و دُنیوی ہر اعتبار سے ہلاکت کے غار میں دھکیل دیا اور اس سے بچنے کا کوئی علاج نظر نہیں آ رہا۔ ہماری ہر تنظیم تفریق اور ہر اجتماع افتراق کا سامان بہم پہنچاتا ہے۔ اور یہی وہ روگ ہے جس نے ملتِ اسلامیہ کو اس عظیم الشان عددی اکثریت کے باوجود پسماندہ بنایا ہوا ہے۔ ہر قوم ہمیں اپنے میں جذب کرنے کی طمع رکھتی ہے۔ مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبہ پر عقائد سے لے کر اعمال و اخلاق تک' ثقافت و معاشرت سے لے کر معاملات و اقتصادیات تک ہر قوم کی یلغار ہے۔ ایک طرف حکومت و اقتدار اور اقتصادیات و تجارت میں ان پر عرصۂ حیات تنگ کیا جا رہا ہے تو

دوسری طرف ملحدانہ تلبیسات کے ذریعہ ان کے عقائد ونظریات کو متزلزل اور ان کی خدا پرستی کے اصول کو نئی تعلیم وتہذیب اور خیر خواہی اور ہمدردی کے عنوان سے ہوا پرستی میں تبدیل کیا جارہا ہے۔ ہمارے عوام انگریز کے ڈیڑھ سو سالہ دورِ اقتدار میں مختلف تدبیروں کے ذریعہ علم دین سے محروم اور حقائق سے ناآشنا کردیے گئے' اب گھر کی دولت علم وفکر گنوا کر جو کچھ دوسروں کی طرف سے آتا ہے' اسی کو سرمایۂ سعادت سمجھنے لگے' خصوصاً جب کہ اس تعلیم وتہذیب کے سایہ میں نفس کی بے لگام خواہشات اور عیش و عشرت کا میدان بھی کھلا نظر آتا ہے' اور ہمارے علماء اہل فکر ونظر اپنے جزوی اور فروعی اختلافات اور بہت سے غیر ضروری مسائل میں ایسے اُلجھ گئے کہ ان کو اسلام کی سرحدوں پر ہونے والی یلغار کی گویا خبر ہی نہیں۔

اسبابِ مرض اور علاج

آج کی اس مجلس میں ملت کا درد رکھنے والے علماء' فضلاء اور مفکرین کا اجتماع نظر آتا ہے' دل چاہتا ہے کہ ملت کے اس مرض کے اسباب اور اس کے علاج پر کچھ غور کیا جائے۔

امیرؔ! جمع ہیں احباب دردِ دل کہہ لے
پھر التفاتِ دلِ دوستاں رہے نہ رہے!

سب سے پہلے میں یہ واضح کردینا چاہتا ہوں کہ نظری مسائل میں آراء کا اختلاف نہ مضر ہے' نہ اس کے مٹانے کی ضرورت ہے اور نہ مٹایا جا سکتا ہے۔ اختلافِ رائے نہ وحدتِ اسلامی کے منافی ہے نہ کسی کے لیے مضر' بلکہ اختلاف رائے ایک فطری اور طبعی امر ہے' جس سے نہ کبھی انسانوں کا کوئی گروہ خالی رہا' نہ رہ سکتا ہے۔ کسی جماعت میں ہر کام اور ہر بات میں مکمل اتفاقِ رائے صرف دو صورتوں میں ہو سکتا ہے' ایک یہ کہ ان میں کوئی سوجھ بوجھ والا انسان نہ ہو جو معاملہ پر غور کرکے کوئی رائے قائم کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو' اس لیے ایسے مجمع میں ایک شخص کوئی بات کہہ دے تو دوسرے سب اس پر اس لیے

اتفاق کر سکتے ہیں کہ ان کے پاس کوئی رائے اور بصیرت ہی نہیں۔ دوسرے اس صورت میں مکمل اتفاقِ رائے ہو سکتا ہے کہ مجمع کے لوگ ضمیر فروش اور خائن ہوں کہ ایک بات کو غلط اور مضر جانتے ہوئے محض دوسروں کی رعایت سے اختلاف کا اظہار نہ کریں۔ اور جہاں عقل بھی ہو اور دیانت بھی یہ ممکن نہیں کہ ان میں اختلافِ رائے نہ ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ اختلافِ رائے عقل و دیانت سے پیدا ہوتا ہے' اس لیے اس کو اپنی ذات کے اعتبار سے مذموم نہیں کہا جا سکتا۔ اور اگر حالات و معاملات کا صحیح جائزہ لیا جائے تو اختلافِ رائے اگر اپنی حدود کے اندر ہے تو وہ کبھی کسی قوم و جماعت کے لیے مضر نہیں ہوتا' بلکہ بہت سے مفید نتائج پیدا کرتا ہے۔ اسلام میں مشورہ کی تکریم اور تاکید فرمانے کا یہی منشاء ہے کہ معاملہ کے متعلق مختلف پہلو اور مختلف آراء سامنے آ جائیں تو فیصلہ بصیرت کے ساتھ کیا جا سکے۔ اگر اختلافِ رائے مذموم سمجھا جائے تو مشورہ کا فائدہ ہی ختم ہو جاتا ہے۔

صحابہؓ و تابعینؒ میں اختلافِ رائے اور اس کا درجہ

انتظامی اور تجرباتی امور میں تو اختلافِ رائے خود رسول کریم ﷺ کے عہدِ مبارک میں آپ ﷺ کی مجلس میں بھی ہوتا رہا اور خلفائے راشدین اور عام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عہد میں امورِ انتظامیہ کے علاوہ جب نئے نئے حوادث اور شرعی مسائل سامنے آئے' جن کا قرآن و حدیث میں صراحتاً ذکر نہ تھا یا قرآن کی ایک آیت کا دوسری آیت سے یا ایک حدیث کا دوسری حدیث سے بظاہر تعارض نظر آیا اور ان کو قرآن و سنت کی نصوص میں غور کر کے تعارض کو رفع کرنے اور شرعی مسائل کے استخراج میں اپنی رائے اور قیاس سے کام لینا پڑا تو ان میں اختلافِ رائے ہوا' جس کا ہونا عقل و دیانت کی بنا پر ناگزیر تھا۔

اذان اور نماز جیسی عبادتیں جو دن میں پانچ مرتبہ میناروں اور مسجدوں میں ادا کی جاتی ہیں' ان کی بھی جزوی کیفیات میں اس مقدس گروہ کے افراد کا خاصا اختلاف نظر آتا

ہے' اور اس کے اختلاف رائے پر باہمی بحث ومباحثہ میں بھی کوئی کمی نظر نہیں آتی۔ ایسے ہی غیر منصوص یا مبہم معاملات حلال وحرام' جائز وناجائز میں بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی آراء کا اختلاف کوئی ڈھکی چھپی چیز نہیں۔ پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے شاگرد حضرات تابعین کا یہ عمل بھی ہر اہل علم کو معلوم ہے کہ ان میں سے کوئی جماعت کسی صحابی کی رائے کو اختیار کر لیتی تھی اور کوئی ان کے مقابل دوسری جماعت دوسرے صحابی کی رائے پر عمل کرتی تھی' لیکن صحابہؓ وتابعین کے اس پورے خیر القرون میں' اس کے بعد ائمہ مجتہدین اور ان کے پیروؤں میں کہیں ایک واقعہ بھی اس کا سننے میں نہیں آیا کہ ایک دوسرے کو گمراہ یا فاسق کہتے ہوں' یا کوئی مخالف فرقہ اور گروہ سمجھ کر ایک دوسرے کے پیچھے اقتداء کرنے سے روکتے ہوں' یا کوئی مسجد میں آنے والا لوگوں سے یہ پوچھ رہا ہو کہ یہاں کے امام اور مقتدیوں کا اذان واقامت کے صیغوں میں' قراءتِ فاتحہ اور رفع یدین وغیرہ میں کیا مسلک ہے۔ ان اختلافات کی بنا پر ایک دوسرے کے خلاف جنگ وجدل یا سب وشتم' توہین' استہزاء اور فقرہ بازی کا تو ان مقدس زمانوں میں کوئی تصور ہی نہ تھا۔

امام ابن عبدالبر قرطبی نے اپنی کتاب ''جامع بیان العلم'' میں سلف کے باہمی اختلافات کا حال الفاظِ ذیل میں بیان کیا ہے:

عن یحییٰ بن سعید قال ما برح اھل الفتویٰ یفتون فیحل ھذا ویحرّم ھذا فلا یریٰ المحرم المحل ھلك لتحلیله ولا یریٰ المحل ان المحرم ھلك لتحریمه[1]

''یحیٰ بن سعید فرماتے ہیں کہ ہمیشہ اہل فتویٰ فتوے دیتے رہے۔ ایک شخص غیر منصوص احکام میں ایک چیز کو حلال قرار دیتا ہے' دوسرا حرام کہتا ہے' مگر نہ حرام کہنے والا یہ سمجھتا ہے کہ جس نے حلال ہونے کا فتویٰ دیا وہ ہلاک اور گمراہ ہو گیا' اور نہ حلال کہنے والا یہ سمجھتا ہے کہ جس نے حرام ہونے کا فتویٰ دیا وہ ہلاک اور گمراہ ہو گیا''۔

اسی کتاب میں نقل کیا ہے کہ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما نے فقیہہ مدینہ حضرت قاسم بن محمد رحمہ اللہ سے ایک مختلف فیہ مسئلہ کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا کہ ان

دونوں آراء میں سے آپ جس پر عمل کر لیں کافی ہے، کیونکہ دونوں طرف صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت کا اُسوہ موجود ہے۔

ایک شبہ اور جواب

یہاں اصولِ دین اور اسبابِ اختلاف سے ناواقف لوگوں کو یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ شریعت اسلام میں ایک چیز حلال بھی ہو اور حرام بھی ہو، جائز بھی ہو اور ناجائز بھی ہو۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں میں سے ایک غلط اور ایک صحیح ہوگی، پھر دونوں جانب کا یکساں احترام کیسے باقی رہ سکتا ہے؟ جس کو ایک آدمی غلط سمجھتا ہے اس کو غلط کہنا عین دیانت ہے۔

جواب یہ ہے کہ کلام مطلق حلال وحرام اور جائز وناجائز میں نہیں، کیونکہ قرآن و سنت کے منصوصات اور تصریحات کے اعتبار سے کچھ چیزیں واضح طور پر حرام ہیں۔ جیسے سود، شراب، جوا، رشوت وغیرہ۔ ان میں دو رائے نہیں ہوسکتیں اور سلف صالحین کا ان میں کہیں اختلاف ہوسکتا تھا؟ اور ان میں اختلاف کرنا تو دین کے بینات اور واضح نصوص کا انکار کرنا بہ اتفاقِ اُمت گمراہی اور الحاد ہے، اور جو ایسا کرے اس سے بیزاری اور براءت کا اعلان کرنا عین تقاضائے ایمان ہے۔ اس میں رواداری ممنوع ہے۔

یہ رواداری کی تلقین اور اختلاف رائے کے باوجود اپنے مخالف کی رائے کا احترام صرف ایسے مسائل میں ہے جو یا تو قرآن وسنت میں صراحتاً مذکور نہیں، یا مذکور ہیں مگر ایسے اجمال یا ابہام کے ساتھ کہ ان کی تشریح وتفسیر کے بغیر ان پر عمل نہیں ہوسکتا، یا دو آیتوں یا دو روایتوں میں بظاہر کچھ تعارض نظر آتا ہے۔ ان سب صورتوں میں مجتہد عالم کو قرآن و سنت اور تعاملِ صحابہ وغیرہ میں غور وفکر کر کے یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ اس کا منشاء اور مفہوم کیا ہے اور اس سے کیا احکام نکلتے ہیں؟ اس صورت میں ممکن ہے کہ ایک عالم مجتہد اصولِ اجتہاد کے مطابق قرآن وسنت اور تعامل صحابہؓ وغیرہ میں غور کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ فلاں کام جائز ہے اور دوسرا عالم مجتہد ان ہی اصولوں میں پورا غور وفکر کر کے اس

کے ناجائز ہونے کو صحیح سمجھے۔ ایسی صورت میں یہ دونوں اللہ تعالیٰ کے نزدیک اجر وثواب کے مستحق ہیں، کسی پر کوئی عتاب نہیں۔ جس کی رائے اللہ تعالیٰ کے نزدیک صحیح ہے اس کو دوہرا اجر وثواب اور جس کی صحیح نہیں اس کو ایک اجر ملے گا۔ اسی سے بعض اہل علم کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اجتہادی اختلافات میں دونوں متضاد قول حق وصحیح ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بے نیاز ہیں، تمام احکام، عبادات ومعاملات سے اللہ تعالیٰ کا مقصود کوئی خاص کام نہیں، بلکہ بندوں کی اطاعت شعاری کا امتحان ہے۔ جب دونوں نے اپنی اپنی غور وفکر اور قوتِ اجتہاد شرائط کے ساتھ خرچ کر لی تو دونوں اپنا فرض ادا کر چکے۔ دونوں صحیح جواب ہیں، مگر جمہور اُمت اور ائمہ مجتہدین کی تحقیق یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں تو ان دونوں میں سے کوئی ایک حق وصحیح ہوتا ہے، تو جو لوگ اپنے اجتہاد سے اس حق کو پالیں وہ ہر حیثیت سے کامیاب اور دوہرے اجر کے مستحق ہیں، اور جو مقدور بھر کوشش کے باوجود اس حق تک نہ پہنچیں تو معذور ہیں، ان پر کوئی ملامت نہیں، بلکہ ان کے سعی وعمل کا ایک اجر اُن کو بھی ملتا ہے۔

ایک اہم واقعہ، اہم نکتہ

ایک اہم واقعہ بھی آپ کے گوش گزار کروں جو اہم بھی ہے اور عبرت خیز بھی۔ قادیان میں ہر سال ہمارا جلسہ ہوا کرتا تھا اور سیدی حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب رحمہ اللہ بھی اس میں شرکت فرمایا کرتے تھے۔ ایک سال اسی جلسہ پر تشریف لائے، میں بھی آپ کے ساتھ تھا۔ ایک صبح نمازِ فجر کے وقت اندھیرے میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ حضرت سر پکڑے ہوئے بہت مغموم بیٹھے ہیں۔ میں نے پوچھا: حضرت کیسا مزاج ہے؟ کہا ہاں! ٹھیک ہی ہے، میاں مزاج کیا پوچھتے ہو، عمر ضائع کر دی۔

میں نے عرض کیا حضرت! آپ کی ساری عمر علم کی خدمت میں، دین کی اشاعت میں گزری ہے۔ ہزاروں آپ کے شاگرد علماء ہیں، مشاہیر ہیں، جو آپ سے مستفید ہوئے اور خدمتِ دین میں لگے ہوئے ہیں، آپ کی عمر اگر ضائع ہوئی تو پھر کس کی عمر کام میں لگی؟

فرمایا: میں تمہیں صحیح کہتا ہوں: عمر ضائع کر دی!

میں نے عرض کیا: حضرت بات کیا ہے؟

فرمایا: ہماری عمر کا' ہماری تقریروں کا' ہماری ساری کدو کاوش کا خلاصہ یہ رہا ہے کہ دوسرے مسلکوں پر حنفیت کی ترجیح قائم کر دیں' امام ابوحنیفہؒ کے مسائل کے دلائل تلاش کریں۔ یہ رہا ہے محور ہماری کوششوں کا' تقریروں کا اور علمی زندگی کا!

اب غور کرتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ کس چیز میں عمر برباد کی؟ ابوحنیفہؒ ہماری ترجیح کے محتاج ہیں کہ ہم ان پر کوئی احسان کریں؟ ان کو اللہ تعالیٰ نے جو مقام دیا ہے وہ مقام لوگوں سے خود اپنا لوہا منوائے گا' وہ تو ہمارے محتاج نہیں۔

اور امام شافعیؒ' امام مالکؒ اور احمد بن حنبلؒ اور دوسرے مسالک کے فقہاء جن کے مقابلے میں ہم یہ ترجیح قائم کرتے آئے ہیں' کیا حاصل ہے اس کا؟ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم زیادہ سے زیادہ اپنے مسلک کو ''صواب محتمل الخطا (درست مسلک جس میں خطا کا احتمال موجود ہے) ثابت کر دیں اور دوسرے کے مسلک کو ''خطا محتمل الصواب'' (غلط مسلک جس کے حق ہونے کا احتمال موجود ہے) کہیں۔ اس سے آگے کوئی نتیجہ نہیں ان تمام بحثوں' تدقیقات اور تحقیقات کا' جن میں ہم مصروف ہیں۔

پھر فرمایا: ارے میاں! اس کا تو کہیں حشر میں بھی راز نہیں کھلے گا کہ کون سا مسلک صواب تھا اور کون سا خطا۔ اجتہادی مسائل صرف یہی نہیں کہ دنیا میں ان کا فیصلہ نہیں ہو سکتا' دنیا میں بھی ہم تمام تر تحقیق و کاوش کے بعد یہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ بھی صحیح' یا یہ کہ یہ صحیح ہے لیکن احتمال موجود ہے کہ یہ خطا ہو' اور وہ خطا ہے اس احتمال کے ساتھ کہ صواب ہو۔ دنیا میں تو یہ ہے ہی' قبر میں بھی منکر نکیر نہیں پوچھیں گے کہ رفع یدین حق تھا یا ترک رفع یدین حق تھا؟ آمین بالجہر حق تھی یا بالسر حق تھی؟ برزخ میں بھی اس کے متعلق سوال نہیں کیا جائے گا اور قبر میں بھی یہ سوال نہیں ہوگا۔

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کے الفاظ یہ تھے:

اللہ تعالیٰ شافعی کو رسوا کرے گا نہ ابوحنیفہ کو نہ مالک کو نہ احمد بن حنبل کو' جن کو اللہ

تعالیٰ نے اپنے دین کے علم کا انعام دیا ہے' جن کے ساتھ اپنی مخلوق کے بہت بڑے حصے کو لگا دیا ہے' جنہوں نے نورِ ہدایت چار سو پھیلایا ہے' جن کی زندگیاں سنت کا نور پھیلانے میں گزریں' اللہ تعالیٰ ان میں سے کسی کو رسوا نہیں کرے گا کہ وہاں میدانِ محشر میں کھڑا کر کے یہ معلوم کرے کہ ابوحنیفہ نے صحیح کہا تھا' یا شافعی نے غلط کہا تھا' یا اس کے برعکس' یہ نہیں ہوگا!

تو جس چیز کو نہ دنیا میں کہیں نکھرنا ہے' نہ برزخ میں اور نہ محشر میں' اسی کے پیچھے پڑ کر ہم نے اپنی عمر ضائع کر دی' اپنی قوت صرف کر دی اور جو صحیح اسلام کی دعوت تھی' مجمع علیہ اور سبھی کے مابین جو مسائل متفقہ تھے' اور دین کی جو ضروریات سبھی کے نزدیک اہم تھیں' جن کی دعوت انبیاء کرام لے کر آئے تھے' جن کی دعوت کو عام کرنے کا ہمیں حکم دیا گیا تھا' اور وہ منکرات جن کو مٹانے کی کوشش ہم پر فرض کی گئی' آج یہ دعوت تو نہیں دی جا رہی۔ یہ ضروریاتِ دین تو لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو رہی ہیں اور اپنے واغیار ان کے چہرے کو مسخ کر رہے ہیں۔ اور وہ منکرات جن کو مٹانے میں ہمیں لگے ہونا چاہیے تھا' وہ پھیل رہے ہیں' گمراہی پھیل رہی ہے' الحاد آ رہا ہے' شرک و بت پرستی چلی آ رہی ہے' حرام و حلال کا امتیاز اٹھ رہا ہے' لیکن ہم لگے ہوئے ہیں ان فرعی و فروعی بحثوں میں!

حضرت شاہ صاحب نے فرمایا: یوں غمگین بیٹھا ہوں اور محسوس کر رہا ہوں کہ عمر ضائع کر دی۔

سلف صالحین میں اختلاف ہو تو لوگوں کو کیا کرنا چاہیے؟

ایسے ہی اختلاف کے متعلق جس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی دو رائیں ہوں' امامِ اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا:

احد القولین خطأ والاثم فیہ موضوع (۲)

''متضاد اقوال میں سے ایک خطا ہے' مگر اس خطا کا گناہ معاف کر دیا گیا ہے''۔

اور امام مالک رحمہ اللہ سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے باہمی اختلافات کے متعلق سوال کیا گیا تو

انہوں نے فرمایا:

خطأ وصواب فانظر فی ذٰلک (۳)

''ان میں بعض خطا ہیں' بعض صواب وصحیح' تو عمل کرنے والے اہل اجتہاد کو غور کر کے کوئی جانب متعین کرنا چاہیے''۔

امام مالکؒ نے اپنے اس ارشاد میں جس طرح یہ واضح کر دیا کہ اختلافِ اجتہادی میں ایک جانب صواب وصحیح اور دوسری جانب خطا ہوتی ہے' دونوں متضاد چیزیں صواب نہیں ہوتیں' اسی طرح یہ بھی ارشاد فرمایا کہ اس اختلاف و خطا دونوں میں باہم جھگڑا اور جدال جائز نہیں۔ صرف اتنا کافی ہے کہ جس کو خطا پر سمجھتا ہے' اس کو نرمی اور خیر خواہی سے خطا پر متنبہ کر دے۔ پھر وہ قبول کرے تو بہتر ورنہ سکوت کرے۔ جدال اور جھگڑا یا بدگوئی نہ کرے۔

حضرت امامؒ کے ارشاد کا پورا متن یہ ہے:

كان مالك يقول المراء والجدال في العلم يذهب بنور العلم من قلب العبد' وقيل له رجل له علم بالسّنة فهو يجادل عنها' قال ولكن ليخبر بالسنة فان قبل منه والاسكت (۴)

''حضرت امام مالکؒ نے فرمایا کہ علم میں جھگڑا اور جدال نورِ علم کو انسان کے قلب سے نکال دیتا ہے۔ کسی نے عرض کیا کہ ایک شخص جس کو سنت کا علم حاصل ہے' کیا وہ حفاظتِ سنت کے لیے جدال کر سکتا ہے؟ فرمایا کہ نہیں! بلکہ اس کو چاہیے کہ مخاطب کو صحیح بات سے آگاہ کر دے' پھر وہ قبول کر لے تو بہتر ہے ورنہ سکوت اختیار کرے۔ (نزاع وجدال سے پرہیز کرے۔)''

محمد بن عبدالرحمٰن صیرفیؒ نے حضرت امام احمد بن حنبلؒ سے سوال کیا کہ جب کسی مسئلہ میں صحابہ کرامؓ باہم مختلف ہوں تو کیا ہمارے لیے یہ جائز ہے کہ ہم ان میں غور وفکر کر کے یہ فیصلہ کریں کہ ان میں صحیح صواب کس کا قول ہے؟ تو فرمایا:

لا يجوز النظر بين اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم

''رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کے اختلاف میں لوگوں کو غور وفکر ہی نہ کرنا چاہیے''۔

صیرفیؒ نے کہا کہ پھر عمل کس کے قول پر اور کس طرح کریں؟

تقلد ایھم شئت (٥)

''ان میں سے جس کا چاہو اتباع کرلو۔ (یہی کافی ہے۔)''

ائمہ مجتہدین کے ان اقوال میں ابوحنیفہ اور مالک رحمہا اللہ کا مسلک تو یہ ہوا کہ جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا باہم کسی مسئلہ میں اختلاف ہو تو بعد کے فقہاء کو چاہیے کہ دلائل میں غور کر کے جس کا قول سنت سے زیادہ قریب تر سمجھیں اس کو اختیار کرلیں' اور امام احمدؒ کے نزدیک اس کی بھی ضرورت نہیں' دونوں طرف جب صحابہؓ ہیں تو جس کا قول چاہے اختیار کرسکتے ہیں۔

حضرت اُبی بن کعبؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ میں ایک مسئلہ میں باہمی اختلاف ہو رہا تھا۔ حضرت فاروق اعظمؓ نے سنا تو غضب ناک ہو کر باہر تشریف لائے اور فرمایا کہ ''افسوس! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں ایسے دو شخص باہم جھگڑ رہے ہیں جن کی طرف لوگوں کی نظریں ہیں اور جن سے لوگ دین کا استفادہ کرتے ہیں۔'' پھر ان دونوں کے اختلافات کا فیصلہ اس طرح فرمایا: صدق اُبیّ ولم یأل ابن مسعود یعنی ''صحیح بات تو اُبی بن کعبؓ کی ہے مگر اجتہاد میں کوتاہی ابن مسعودؓ نے بھی نہیں کی''۔ پھر فرمایا کہ ''مگر میں آئندہ ایسے مسائل میں جھگڑا کرتا ہوا کسی کو نہ دیکھوں' ورنہ اتنی سزا دوں گا''۔ (٦)

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد سے ایک تو یہ بات ثابت ہوئی کہ اجتہادی مسائل واختلافات میں ایک قول صواب وصحیح ہوتا ہے' اور دوسرا اگرچہ صواب نہیں مگر ملامت اس پر بھی نہیں کی جاسکتی۔

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ ایسے اجتہادی مسائل میں خلاف واختلاف پر زیادہ زور دینا مقتدایانِ اہل علم کے لیے مناسب نہیں' جس سے ایک دوسرے پر ملامت یا نزاع وجدال کے خطرات پیدا ہوجائیں۔

امام شافعیؒ کے ایک مفصل کلام کو نقل کر کے ابن عبدالبرؒ نے فرمایا کہ امام شافعیؒ کے اس کلام میں اس کی دلیل موجود ہے کہ مجتہدین کو آپس میں ایک دوسرے کا تخطیہ نہ کرنا

چاہیے۔ یعنی ان میں کوئی ایک دوسرے کو یہ نہ کہے کہ آپ غلطی اور خطا پر ہیں۔ (۲) وجہ یہ ہے کہ ایسے اجتہادی مسائل میں کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اپنے قول کو یقینی طور پر صواب وصحیح اور دوسرے کے قول کو یقینی طور پر خطا وغلط کہے۔ اجتہاد اور پورے غور وفکر کے بعد بھی جو رائے قائم کی ہے اس کے متعلق اس سے زیادہ کہنے کا کسی کو حق نہیں کہ رائے صحیح وصواب ہے، مگر احتمال خطا اور غلطی کا بھی ہے اور ہوسکتا ہے کہ دوسرے کا قول صحیح وصواب ہو۔

خلاصہ یہ کہ اجتہادی اختلافات میں جمہور علماء کے نزدیک علم الٰہی کے اعتبار سے دو مختلف آراء میں سے حق تو کوئی ایک ہی ہوتی ہے، مگر اس کا متعین کرنا کہ ان میں سے حق کیا ہے، اس کا یقینی ذریعہ کسی کے پاس نہیں، دونوں طرف خطا وصواب کا احتمال دائر ہے۔ مجتہد اپنے غور وفکر سے کسی ایک جانب کو راجح قرار دے کر عمل کے لیے اختیار کر لیتا ہے۔

ایک اہم ارشاد

استاذ الاساتذہ سیدی حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیریؒ سابق صدر مدرس دارالعلوم دیوبند نے ایک مرتبہ فرمایا کہ اجتہادی مسائل اور ان کے اختلاف جن میں ہم اور عام اہلِ علم اُلجھتے رہتے ہیں اور علم کا پورا زور اس پر خرچ کرتے ہیں، ان میں صحیح وغلط کا فیصلہ دنیا میں تو کیا ہوتا، میرا گمان تو یہ ہے کہ محشر میں بھی اس کا اعلان نہیں ہوگا۔ کیونکہ ربِّ کریم نے جب دُنیا میں کسی امام مجتہد کو باوجود خطا ہونے کے ایک اجر وثواب سے نوازا ہے اور ان کی خطا پر پردہ ڈالا ہے تو اس کریم الکرماء کی رحمت سے بہت بعید ہے کہ وہ محشر میں اپنے ان مقبولانِ بارگاہ میں سے کسی کی خطا کا اعلان کر کے اس کو رسوا کریں۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ جن مسائل میں صحابہؓ وتابعینؒ اور ائمۂ مجتہدینؒ کا نظری اختلاف ہوا ہے، ان کا قطعی فیصلہ نہ یہاں ہوگا نہ آخرت میں، کیونکہ عمل کرنے والوں کے لیے ان میں سے ہر ایک کی رائے پر اپنی ترجیح کے مطابق عمل کر لینا جائز قرار دے دیا گیا ہے۔ اور جس نے اس کے مطابق عمل کر لیا وہ فرض سے سبکدوش ہوگیا۔ اس کو

یہ اجماعِ اُمت تارکِ فرض نہیں کہا جا سکتا۔ ان مسائل میں کوئی عالم کتنی ہی تحقیقات کرے، یہ ممکن نہیں ہے کہ اس کی تحقیق کو یقینی حق و صواب کہا جائے اور اس کے مقابل کو باطل قرار دیا جائے۔ امام حدیث حافظ شمس الدین ذہبیؒ نے فرمایا ہے کہ جس مسئلہ میں صحابہؓ و تابعینؒ کا اختلاف ہو گیا وہ اختلاف قیامت تک مٹایا نہیں جا سکتا، کیونکہ اس کے مٹانے کی ایک ہی صورت ہے کہ ان میں سے ایک گروہ کو قطعی طور پر حق پر اور دوسرے کو یقینی طور پر باطل پر قرار دیا جائے، اور یہ ممکن نہیں ہے۔

ائمہ مجتہدین کے اختلاف میں کوئی جانب منکر نہیں ہوتی

مذکورۃ الصدر تصریحات سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جس مسئلہ میں صحابہؓ و تابعینؒ اور ائمہ مجتہدینؒ کا اختلاف ہو، اس کی کوئی جانب شرعی حیثیت سے منکر نہیں کہلائے گی، کیونکہ دونوں آراء کی بنیاد قرآن و سنت اور ان کے مسلّمہ اصول پر ہے۔ اس لیے دونوں جانبین داخل معروف ہیں، زیادہ سے زیادہ ایک کو راجح اور دوسرے کو مرجوح کہا جا سکتا ہے۔ اس لیے ان مسائلِ مجتہد فیہا میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ بھی کسی پر عائد نہیں ہوتا، بلکہ غیر منکر پر نکیر کرنا خود ایک منکر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سلف صالحین کا بے شمار مسائل میں جواز و عدم جواز اور حرمت و حلت کا اختلاف ہونے کے باوجود کہیں منقول نہیں کہ ان میں سے ایک دوسرے پر اس طرح نکیر کرتا ہو جیسے منکرات پر کی جاتی ہے، یا ایک دوسرے کو یا اس کے متبعین کو گمراہی یا فسق و فجور کی طرف منسوب کرتا ہو، یا اس کو ترکِ وظیفہ یا ارتکاب حرام کا مجرم قرار دیتا ہو۔ حافظ ابن عبد البرؒ نے امام شافعیؒ کا جو قول نقل کیا ہے، وہ بھی اس پر شاہد ہے جس میں فرمایا ہے کہ ایک مجتہد کو دوسرے مجتہد کا تخطیہ یعنی اس کو خطاوار مجرم کہنا جائز نہیں۔

شرائط اجتہاد

حضرت امام شافعیؒ نے جہاں مجتہدین کے آپس میں ایک دوسرے کے تخطیہ کو

نادرست قرار دیا ہے وہیں اس کی معقول وجہ اور ایک شرط کا بھی ذکر کیا ہے۔ ان کی عبارت کا متن یہ ہے:

وفی هذا من قول الشافعی دلیل علی ترك تخطئة المجتهدین بعضهم لبعضٍ، اذ کلّ واحد منهم قد ادّی ما کلف باجتهادہٖ اذا کان ممن اجتمعت فیه آلة القیاس و کان ممّن لهٗ ان یجتهد ویقیس[۸]

''امام شافعیؒ کے کلام میں اس کی دلیل موجود ہے کہ کوئی مجتہد دوسرے مجتہد کو خطاوار نہ قرار دے، کیونکہ ان میں سے ہر ایک نے وہ فرض ادا کر دیا جو اس کے ذمہ تھا۔ یعنی اس کے اجتہاد اور قیاس کے شرائط موجود ہوں اور اہل اجتہاد کے نزدیک اس کو اجتہاد و قیاس کا حق حاصل ہو''۔

اس سے معلوم ہوا کہ دو مختلف آراء کا یہ احترام کہ ان میں سے کسی کو منکر نہ کہا جائے اور اس کے کہنے ماننے والوں کو خطاوار نہ کہا جائے، یہ صرف اس صورت میں ہے کہ اجتہاد صحیح اس کی شرائط کے مطابق ہو۔ آج کل کا سا جاہلانہ اجتہاد نہ ہو کہ جس کو عربی زبان بھی پوری نہیں آتی اور قرآن وحدیث سے اس کا رابطہ کبھی نہیں رہا، اردو اور انگریزی ترجموں کے سہارے قرآن وحدیث پر مشق شروع کر دی۔ ایسا اجتہاد خود ایک گناہِ عظیم ہے اور اس سے پیدا ہونے والی رائے دوسرا گناہ اور گمراہی اور خلاف وشقاق ہے جس پر نکیر واجب ہے۔

سنّت وبدعت کی کشمکش میں صحیح طرزِ عمل

ہمارے معاشرے میں مذہب کے نام پر ایک اختلاف وہ بھی ہے جو بدعت وسنت کے عنوان سے پیدا ہوا کہ بہت سے لوگوں نے قرآن وسنت کی تعبیر میں اصولِ صحیحہ کو چھوڑ کر ذاتی آراء کو امام بنا لیا اور نئے نئے مسائل پیدا کر دیے۔ اس قسم کے اختلافات بلاشبہ وہ تفرق وافتراق ہیں جن سے قرآن وسنت میں مسلمانوں کو ڈرایا گیا ہے۔ ان کے ختم یا کم کرنے کی کوشش بلاشبہ مفید ہے، لیکن قرآن کریم نے اس کا بھی ایک خاص طریق بتلایا ہے جس کے ذریعے تفرق کی خلیج کم ہوتی چلی جائے، بڑھنے نہ پائے۔ یہ وہی اصولِ دعوت الی الخیر ہیں جن میں سب سے پہلے حکمت وتدبیر، پھر خیر خواہی وہمدردی اور

نرم قابلِ قبول عنوان سے قرآن کریم کے صحیح مفہوم کی طرف بلاتا ہے' اور آخر میں "مجادلة بالتی ھی احسن" یعنی حجت و دلیل کے ساتھ افہام و تفہیم کی کوشش ہے۔ مگر افسوس کہ آج کل عام اہلِ علم اور مصلحین نے ان اصولوں کو نظر انداز کر دیا' صرف جدال میں اور وہ بھی غیر مشروط انداز سے مشغول ہو گئے کہ اپنے حریف کا استہزاء' تمسخر اور اس کو زیر کرنے کے لیے جھوٹے' سچے' جائز و ناجائز حربے استعمال کرنا اختیار کر لیا' جس کے نتیجہ میں جنگ و جدال کا بازار تو گرم ہو گیا مگر اصلاحِ خلق کا کوئی پہلو نہ نکلا۔

افتراقِ اُمت کے اسباب

میں نے اس تمہیدی گزارش کو اتنا طول دینا اور اتنی تفصیل سے بیان کرنا اس لیے گوارا کیا کہ مسلمانوں کے طبقات اہل دین و اصلاح اور دینی خدمات انجام دینے والوں کے مابین جو تفرقہ آج پایا جاتا ہے وہ عموماً انہی حقائق کو نظر انداز کرنے کا نتیجہ ہے۔

اب میں ان اسباب و عوامل کو پیش کرتا ہوں جو میرے غور و فکر کی حد تک مسلمانوں میں باہمی آویزش اور شقاق و جدال کا سبب بنے ہوئے ہیں' اور افسوس اس کا ہے کہ اس کو خدمتِ دین سمجھ کر اختیار کیا جاتا ہے۔

غُلو: میرے نزدیک اس جنگ و جدل کا ایک بہت بڑا سبب فروعی اور اجتہادی مسائل میں تحزب و تعصب اور اپنی اختیار کردہ راہِ عمل کے خلاف کو عملاً باطل اور گناہ قرار دینا' اور اس پر عمل کرنے والوں کے ساتھ ایسا معاملہ کرنا ہے جو اہلِ باطل اور گمراہوں کے ساتھ کرنا چاہیے تھا۔ اس پر تمام اُمت کا اتفاق بھی ہے اور عقلاً اس کے سوا کوئی صورت بھی دین پر عمل کرنے کی نہیں ہے کہ جو لوگ خود درجہ اجتہاد کا نہیں رکھتے' وہ اجتہادی مسائل میں کسی امام مجتہد کا اتباع کریں' اور جن لوگوں نے اپنے نفس کو آزادی اور ہوا پرستی سے روکنے کے لیے دینی مصلحت سمجھ کر کسی ایک امام مجتہد کا اتباع اختیار کر لیا ہے' وہ قدرتی طور پر ایک جماعت بن جاتی ہے۔ اسی طرح دوسرے مجتہد کا اتباع کرنے والے ایک دوسری جماعت کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ اگر جماعت بندی مثبت انداز میں صرف

اجتہادی مسائل کی حد تک' اپنی تعلیمی اور عملی آسانیوں کے لیے ہو' تو نہ اس میں کوئی مضائقہ ہے' نہ کوئی تفرقہ اور نہ ملت کے لیے اس میں مضرت۔

مضرت رساں اور تباہ کن ایک تو اس کا منفی پہلو یہ ہے کہ اپنی رائے اور اختیار سے اختلاف رکھنے والوں کے ساتھ جنگ وجدل اور دوسرے ان فروعی مسائل کی بحثوں میں غلو کہ سارا علم وتحقیق کا زور اور بحث وتمحیص کی طاقت اور عمر کے اوقاتِ عزیز انہی بحثوں کی نذر ہو جائیں۔ اگرچہ ایمان واسلام کے بنیادی اور قطعی اجماعی مسائل مجروح ہو رہے ہیں' کفر والحاد دنیا میں پھیل رہا ہے' سب سے صرف نظر کر کے ہمارا علمی مشغلہ یہی فروعی بحثیں بنی رہیں' جن کے متعلق مذکورۃ الصدر تفصیل میں ابھی آپ معلوم کر چکے ہیں کہ ان میں ہزار تحقیقات کے بعد بھی بات اس سے آگے نہیں بڑھتی کہ یہ راجح ہے اور اس کے خلاف مرجوح' اور اس راجح مرجوح کا بھی یقینی فیصلہ نہ دنیا میں ہو سکتا ہے' نہ برزخ میں ان کا سوال ہوگا' نہ محشر میں اس راجح مرجوح کا اعلان ہوگا۔

اسی طرح نہ ان مسائل میں اختلاف رکھنے والوں پر نکیر کرنا درست ہے' نہ ان کو خطا کار مجرم ٹھہرانا صحیح ہے۔ اس وقت ہماری قوم کا برگزیدہ ترین طبقہ علماء وفقہاء کا' خصوصاً جو تعلیم وتصنیف میں مشغول ہیں' ان کی شبانہ روز مشغولیت کا جائزہ لیا جائے تو بیشتر حضرات کی علمی تحقیقات اور سعی وعمل کی ساری توانائی انہی فروعی بحثوں میں محدود نظر آئے گی۔

لمحۂ فکریہ

ان میں بعض حضرات کا غلو تو یہاں تک بڑھا ہوا ہے کہ اپنے سے مختلف رائے رکھنے والوں کی نماز کو فاسد اور اُن کو تارکِ قرآن سمجھ کر اپنے مخصوص مسلک کی اس طرح دعوت دیتے ہیں جیسے کسی منکر اسلام کو اسلام کی دعوت دی جا رہی ہو' اور اسی کو دین کی سب سے بڑی خدمت سمجھے ہوئے ہیں۔

معلوم نہیں کہ یہ حضرات اسلام کی بنیادوں پر چاروں طرف سے حملہ آور طوفانوں

سے باخبر نہیں یا جان بوجھ کر اغماض کرتے ہیں! اس وقت جبکہ ایک طرف تو کھلے ہوئے کفر' عیسائیت اور کمیونزم نے پورے اسلامی ممالک اور اسلامی حلقوں پر گھیرا ڈالا ہوا ہے' اور یہ دونوں کفر طوفانی رفتار کے ساتھ اسلامی ممالک میں پھیل رہے ہیں' صرف پاکستان میں ہزاروں کی تعداد ہر سال مرتد ہو جاتی ہے۔ دوسری طرف کفر' نفاق اور الحاد خود اسلام کا نام لینے والوں میں کہیں قادیانیت اور مرزائیت کے لباس میں' کہیں پرویزیت اور انکارِ حدیث کے عنوان سے' کہیں مغرب سے لائی ہوئی اباحیت اور تمام محرماتِ شرعیہ کو حلال کرنے کے طریقوں سے ہمارے ایمان پر ڈاکہ ڈال رہے ہیں۔ اور یہ الحاد' کفر و نفاق پہلے کفر سے اس لیے زیادہ خطرناک ہے کہ اسلام اور قرآن کے عنوان کے ساتھ آتا ہے' جن کے دام میں سیدھے سادھے جاہل عوام کا تو ذکر ہی کیا ہے' ہمارے نو تعلیم یافتہ نوجوان بہ کثرت اس لیے آ جاتے ہیں کہ نئی تعلیم اور نئی معاشرت نے ان کو دینی تعلیم اور اسلامی اصولوں سے اتنا دور پھینک دیا ہے کہ وہ مادی علوم و فنون کے ماہر کہلانے کے باوجود مذہب اور دین کی ابتدائی معلومات سے بھی محروم کر دیے گئے ہیں۔ اور کھلے اور چھپے کفر کی ان ساری اقسام سے بھی اگر کچھ خوش نصیب مسلمان بچ جائیں تو فحاشی' عریانی' ننگے ناچ' رقص و سرود کی محفلوں' گھر گھر ریڈیو (اور ٹی وی) کے ذریعہ فلمی گانوں اور سینماؤں کی زہریلی فضاؤں سے کون ہے جو بچ نکلے!

اسلام اور قرآن کا نام لینے والے مسلمان آج سارے جرائم اور بداخلاقیوں میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ ہمارے بازار جھوٹ' فریب' سود' قمار سے بھرے ہوئے ہیں' اور ان کے چلانے والے کوئی یہودی نہیں' ہندو بنیے نہیں بلکہ اسلام کے نام لیوا ہیں۔ ہمارے سرکاری محکمے رشوت' ظلم و جور' کام چوری' بے رحمی اور سخت دلی کی تربیت گاہیں بنے ہوئے ہیں' اور ان کے کارفرما بھی نہ انگریز ہیں' نہ ہندو...... محمد مصطفیٰ ﷺ کے نام لینے والے اور روزِ آخر پر ایمان کا دعویٰ رکھنے والے ہیں۔ ہمارے عوام علمِ دین سے کورے' جہالتوں میں ڈوبے ہوئے' دین کے فرائض و واجبات سے بیگانہ' مشرکانہ رسموں اور کھیل تماشوں کے دلدادہ ہیں۔

اے بسرا پردۂ یثرب بخواب
خیز! کہ شد مشرق و مغرب خراب!

ان حالات میں کیا ہم پر یہ واجب نہیں کہ ہم غور و فکر سے کام لیں اور سوچیں کہ اس وقت ہمارے آقا رسول کریم ﷺ کا مطالبہ اور توقع اہل علم سے کیا ہوگی؟ اور اگر محشر میں آپؐ نے ہم سے سوال کر لیا کہ میرے دین اور شریعت پر اس طرح کے حملے ہو رہے تھے' میری اُمت اس بدحالی میں مبتلا تھی' تم وراثتِ نبوت کے دعوے دار کہاں تھے؟ تم نے اس وراثت کا کیا حق ادا کیا؟ تو کیا ہمارا یہ جواب کافی ہو جائے گا کہ ہم نے رفع یدین کے مسئلے پر ایک کتاب لکھی تھی' یا کچھ طلبہ کو شرح جامی کی بحث حاصل محصول خوب سمجھائی تھی' یا حدیث میں آنے والے اجتہادی مسائل پر بڑی دلچسپ تقریریں کی تھیں' یا صحافیانہ زورِ قلم اور فقرہ بازی کے ذریعہ دوسرے علماء و فضلاء کو خوب ذلیل کیا تھا۔

فروعی اور اجتہادی مسائل میں بحث و تمحیص کوئی مذموم چیز نہیں' اگر وہ اپنی حد کے اندر' اخلاص سے' اللہ کے لیے ہوتی' لیکن جہاں ہم یہ دیکھ رہے ہوں کہ اسلام و ایمان کی بنیادیں متزلزل کر دینے والے فتنوں کی خبر ہم سنتے ہیں' اللہ و رسولؐ کے احکام کی خلاف ورزی بلکہ استہزاء و تمسخر اپنی آنکھوں سے دیکھتے اور کانوں سے سنتے ہیں' مگر ہمارے کان پر جوں تک نہیں رینگتی' تو اس کی کیا توقع کی جا سکتی ہے کہ یہ فروعی بحثیں ہم اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے لیے کر رہے ہیں؟ اگر ان میں کچھ للّٰہیت اور اخلاص ہوتا تو ہم ان حالات کے تحت اسلام اور دین کے تقاضوں کو پہچانتے اور فروع سے زیادہ اصولِ اسلام کی حفاظت میں لگے ہوتے۔ ہم نے تو گویا علمی اور دینی خدمات کو انہی فروعی مباحث میں منحصر کر رکھا ہے اور سعی و عمل کی پوری توانائی اسی پر لگا رکھی ہے' اسلام کے اصولی اور بنیادی مسائل اور ایمان کی سرحدوں کو دشمنوں کی یلغار کے لیے خالی چھوڑ دیا ہے۔ لڑنا کس محاذ پر چاہیے تھا اور ہم نے طاقت کس محاذ پر لگا دی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون! یہ تو

---

۱ حضور سرورِ کونین فداہ ابی و امی ﷺ سے اس انداز سے خطاب تاویلاً ہی جائز ہو سکتا ہے اور جب ایک موحد ایسے الفاظ استعمال کرے گا تو اس سے مراد استعانت و استغاثہ نہیں ہوگی۔ (ع۔ا)

تحزب وتعصب کے غلو کا نتیجہ ہے۔

اسی کے ساتھ دوسری بھاری غلطی ان اجتہادی مسائل میں اختلاف کے حدود کو توڑ کر تفرق وتشتت' جنگ و جدل اور ایک دوسرے کے ساتھ تمسخر و استہزاء تک پہنچ جانا ہے جو کسی شریعت وملت میں روا نہیں' اور افسوس ہے کہ یہ سب کچھ خدمت علم دین کے نام پر کیا جاتا ہے۔ اور جب یہ معاملہ ان علماء کے متبعین عوام تک پہنچتا ہے تو وہ اس لڑائی کو ایک جہاد قرار دے کر لڑتے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ جس قوم کا جہاد خود اپنے ہی دست و بازو سے ہونے لگے اس کو کسی غنیم کی مدافعت اور کفر والحاد کے ساتھ جنگ کی فرصت کہاں!

قرآن وحدیث میں اسی تجاوز عن الحدود کا نام تفرق ہے جو جائز اختلاف رائے سے الگ ایک چیز ہے۔ قرآن مجید میں ایک جگہ ارشاد ہے: ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۠﴾ (آل عمران: ۱۰۳)۔ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک وصیت کا ذکر ہے جو تمام انبیاءِ سابقین کو کی گئی ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں: ﴿اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ۭ﴾ (الشوریٰ: ۱۳)۔ امام تفسیر ابو العالیہؒ نے فرمایا کہ اقامتِ دین سے مراد اخلاص ہے' اور لَا تَتَفَرَّقُوْا کا مطلب یہ ہے کہ آپس میں عداوت نہ کرو' بھائی بھائی بن کر رہو۔

اس وصیت کے بعد قرآن میں بنی اسرائیل کے تفرق کا بیان کر کے اہل اسلام کو متنبہ کیا گیا ہے کہ وہ ان کے طریقہ پر نہ جائیں۔ اس میں ارشاد ہے: ﴿وَمَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۭ﴾ (الشوریٰ: ۱۴)۔ حضرت ابو العالیہؒ نے اس کی تفسیر میں فرمایا کہ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ میں اشارہ ہے کہ ایسے اختلاف کا عداوت اور جنگ و جدل تک پہنچنا کبھی دین کے سبب سے نہیں ہوتا' بلکہ بغيا على الدنيا وملكها وزخرفها وزينتها وسلطانها[1] یعنی یہ عداوت' جب بھی غور کرو تو اس کا سبب دنیا' حبِ مال یا حبِ جاہ ہوتا ہے' جس کو نفس وشیطان خدمتِ دین کا عنوان دے کر مزین کر دیتا ہے' ورنہ اس طرح کے مسائل میں اختلافِ رائے کی حد وہی ہے' جو پہلے بیان ہو چکی ہے' کہ

مثبت طور پر اپنے عمل کے لیے ایک جانب کو اَصلح سمجھ کر اختیار کر لیں اور اس سے مختلف مسلک رکھنے والوں سے لڑتے نہ پھریں۔ جس طرح دنیا میں انسان جب بیمار ہوتا ہے' اپنے معالجہ کے لیے کسی ایک حکیم یا ڈاکٹر کا انتخاب کر کے صرف اسی کے قول پر بھروسہ کرتا ہے اور اسی کی ہدایات پر عمل کرتا ہے' مگر دوسرے ڈاکٹروں کو برا بھلا کہتا نہیں پھرتا۔ آپ کسی ایک شخص کو وکیل بنا کر اپنا مقدمہ اس کے سپرد کر دیتے ہیں' مگر دوسرے وکلاء سے لڑتے نہیں پھرتے۔ اجتہادی اور مختلف فیہ مسائل میں بھی ٹھیک یہی آپ کا طرزِ عمل ہونا چاہیے۔

جماعتوں کا غلو

ہماری دینی جماعتیں جو تعلیم دین' یا ارشاد و تلقین' یا دعوت و تبلیغ اور اصلاحِ معاشرہ کے لیے قائم ہیں اور اپنی اپنی جگہ مفید خدمات بھی انجام دے رہی ہیں ان میں بہت سے علماء و صلحاء اور مخلصین کام کر رہے ہیں۔ اگر یہی متحد ہو کر تقسیم کار کے ذریعہ دین میں پیدا ہونے والے تمام رخنوں کے انسداد کی فکر اور امکانی حد تک باہم تعاون کرنے لگیں' اور اقامت دین کے مشترک مقصد کی خاطر ہر جماعت دوسری کو اپنا دست و بازو سمجھے اور دوسروں کے کام کی ایسی ہی قدر کریں جیسی اپنے کام کی کرتے ہیں' تو یہ مختلف جماعتیں اپنے اپنے نظام میں الگ رہتے ہوئے بھی اسلام کی ایک عظیم الشان طاقت بن سکتی ہیں اور ایک عمل کے ذریعے اکثر دینی ضرورتوں کو پورا کر سکتی ہیں۔

مگر عموماً یہ ہو رہا ہے کہ ہر جماعت نے جو اپنے سعی و عمل کا ایک دائرہ اور نظامِ عمل بنایا ہے' عملی طور پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ خدمتِ دین کو اسی میں منحصر سمجھ رہے ہیں' گو زبان سے نہ کہیں۔ دوسری جماعتوں سے اگر جنگ و جدل بھی نہیں تو بے قدری ضرور دیکھی جاتی ہے۔ اس کے نتیجہ میں ان جماعتوں میں بھی ایک قسم کا تشتت پایا جاتا ہے۔

غور کرنے سے اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ مقصد سب کا اگرچہ دین کی اشاعت' حفاظت اور مسلمانوں کی علمی' عملی اور اخلاقی اصلاح ہی ہے' لیکن اس مقصد کے حاصل کرنے کے لیے کسی نے ایک دار العلوم قائم کر کے تعلیم دین کی اہم خدمت انجام دی'

کسی نے ایک تبلیغی جماعت بنا کر رشد و ہدایت کا فرض ادا کیا' کسی نے کوئی انجمن بنا کر احکامِ دین کی نشر و اشاعت کا تحریری انتظام کیا' کسی نے فتویٰ کے ذریعے خلق خدا کو ضروری احکام بتانے کے لیے دارالافتاء قائم کیا' کسی نے اسلام کے خلاف ملحدانہ تلبیسات کے جواب کے لیے تصنیفات کا یا ہفتہ واری یا ماہواری رسالہ اخبار کا سلسلہ جاری کیا۔ یہ سب کام اگرچہ صورت میں مختلف ہیں' مگر درحقیقت ایک ہی مقصد کے اجزاء ہیں۔ ان مختلف محاذوں پر جو مختلف جماعتیں کام کریں گی یہ ضرور ہے کہ ہر ایک کا نظامِ عمل مختلف ہوگا' اس لیے ہر جماعت نے بجا طور پر سہولت کے لیے اپنے اپنے مذاق اور ماحول کے مطابق ایک نظامِ عمل اور اس کے اصول و قواعد بنا رکھے ہیں اور ہر جماعت ان کی پابند ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ اصل مقصد تو منصوص' قطعی اور قرآن و سنت سے ثابت ہے' اس سے انحراف کرنا قرآن و سنت کی حدود سے نکلنا ہے' لیکن یہ اپنا بنایا ہوا نظامِ عمل اور اس کے تنظیمی اصول و قواعد نہ منصوص ہیں' نہ ان کا اتباع از روئے شرع ہر ایک کے لیے ضروری ہے' بلکہ جماعت کے ذمہ داروں نے سہولتِ عمل کے لیے ان کو اختیار کر لیا ہے۔ ان میں حسب ضرورت تبدیلیاں وہ خود بھی کرتے رہتے ہیں اور حالات اور ماحول بدلنے پر اس کو چھوڑ کر کوئی دوسرا نظامِ عمل بنا لینا بھی کسی کے نزدیک ناجائز یا مکروہ نہیں ہوتا' مگر اس میں علمی غلو تقریباً ہر جماعت میں یہ پایا جاتا ہے کہ اپنے مجوزہ نظامِ عمل کو مقصد منصوص کا درجہ دے دیا گیا۔ جو شخص اس نظامِ عمل میں شریک نہیں اگرچہ مقصد کا کتنا ہی عظیم کام کر رہا ہو' اس کو اپنا بھائی اور اپنا شریکِ کار نہیں سمجھا جاتا' اور اگر کوئی اس نظامِ عمل میں شریک تھا پھر کسی وجہ سے اس میں شریک نہ رہا تو عملاً اسے اصل مقصد اور دین سے منحرف سمجھ لیا جاتا ہے اور اس کے ساتھ وہی معاملہ کیا جاتا ہے جو دین سے انحراف کرنے والوں کے ساتھ ہونا چاہیے' اگرچہ وہ اصل مقصد یعنی اقامتِ دین کی خدمت پہلے سے بھی زیادہ کرنے لگے۔ اس غلو کے نتیجے میں وہی تحزب و تعصب اور گروہ بندی کی آفتیں اچھے خاصے دیندار لوگوں میں پیدا ہو جاتی ہیں جو جاہلی عصبیتوں میں مبتلا لوگوں میں پائی جاتی ہیں۔

پیغمبرانہ دعوت کو نظر انداز کرنا

ہماری تبلیغ و دعوت اور اصلاحی کوششوں کو بے کار کرنے اور تفرقہ اور جنگ وجدل کی خلیج کو وسیع کرنے میں سب سے زیادہ دخل اس کو ہے کہ آج کل کے اہل زبان اور اہل قلم علماء نے عموماً دعوت و اصلاح کے پیغمبرانہ طریقوں کو نظر انداز کر کے صحافیانہ زبان اور فقرے چست کرنے ہی کو بات میں وزن پیدا کرنے اور مؤثر بنانے کا ذریعہ سمجھ لیا ہے۔ اور تجربے و مشاہدے سے واضح ہے کہ یہ ایک ایسا منحوس طریقہ ہے کہ اس سے خطا کار یا گمراہ کی اصلاح کی کبھی توقع نہیں رکھی جا سکتی۔ یہ طریق کار ان کو ضد اور ہٹ دھرمی پر اور زیادہ مضبوط کر دیتا ہے، اور اصلاح کے بجائے دلوں میں دشمنی کے بیج بوتا ہے اور عداوت کی آگ بھڑکاتا ہے۔ ہاں اپنے ہوا خواہوں اور معتقدین کے لیے کچھ دیر کا سامانِ تفریح ضرور ہو جاتا ہے اور ان کی دادِ سخن دینے سے لکھنے والے بھی کچھ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ہم نے دین کی بڑی اچھی خدمت کی ہے۔

لیکن جو لوگ اس مضمون کے مخاطب ہوتے ہیں، ان کے دلوں سے پوچھیے کہ اگر کسی وقت ان کو اس بات کے حق ہونے کا یقین بھی ہو جائے تو یہ فقرہ بازی اور تمسخر و استہزاء کا طریق ان کو حق کی طرف آنے سے مانع نہیں بن جاتا؟ اور انہیں ہمیشہ کے لیے اس داعی کا دشمن نہیں بنا دیتا ہے؟

پیغمبرانہ دعوت کے عناصرِ اربعہ

اس کے بالمقابل اللہ تعالیٰ کے رسولوں اور پیغمبروں کی دعوت کا طریقہ ملاحظہ فرمایا جائے تو اس کے الفاظ سادہ مگر عام فہم انسانی ہمدردی سے لبریز اور نرم ہوتے ہیں۔ وہ مخالفین کی سخت ترین بدکلامی سن کر بھی جواب سادہ اور نرم دیتے ہیں، فقرے نہیں کستے، دل میں ہمدردی کا جذبہ ہوتا ہے کہ کسی طرح یہ حق بات قبول کر لے۔ اس کے لیے حکمت کے ساتھ تدبیریں کرتے ہیں۔

پیغمبرانہ دعوت کی روح قرآن کے ایک لفظ نذیر سے سمجھی جاسکتی ہے جو ہر پیغمبر کے لیے قرآن کریم میں استعمال ہوا ہے۔

قرآن کریم میں جا بجا ان کو بشیر و نذیر کہا گیا ہے۔ لفظ نذیر کا ترجمہ اردو میں ڈرانے والے کا کیا جاتا ہے، مگر ڈرانے کا لفظ نذیر کا پورا مفہوم ادا نہیں کرتا۔ اردو زبان کی تنگی کی وجہ سے اس ترجمہ کو اختیار کرلیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ڈرانے کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں، چور ڈاکو کا بھی ڈرانا ہے، درندہ اور دشمن کا بھی ڈرانا ہے اور ایک شفیق باپ بھی اپنے بچہ کو سانپ، بچھو، زہر اور آگ سے ڈراتا ہے۔ پہلی قسم نری تخویف ہے نذارت وانذار نہیں۔ چور، ڈاکو یا دشمن اور درندہ کو نذیر نہیں کہا جائے گا، اور دوسری قسم جو مہربان باپ کی طرف سے ہے، وہ ڈرانا شفقت و ہمدردی کی بنا پر ہے۔ مضر اور تکلیف دہ چیزوں سے ڈرانے والے کو نذیر کہا جاتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کے لیے نذیر کا لفظ استعمال فرما کر ان کی تبلیغ و تعلیم کی روح کی طرف اشارہ کردیا گیا۔ وہ صرف کوئی پیغام ہی نہیں پہنچاتے، بلکہ حکمت اور ہمدردی اور خیر خواہی سے اس پیغام کو مؤثر بنانے اور مخاطب کو ہلاکت سے بچانے کی پوری تدبیر اور کوشش بھی کرتے ہیں۔

قرآن کریم میں دعوتِ پیغمبرانہ کے جو اصول ایک آیت میں بیان کیے گئے ہیں، وہ گویا اس لفظ نذیر کی شرح ہیں۔ ارشاد ربانی ہے: ﴿اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ﴾ (النحل:۱۲۵) اس میں دعوت الی اللہ کے آداب میں سب سے پہلے بالحکمۃ کو رکھا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ داعی کا کام صرف ایک پیغام و کلام کو لوگوں کے کانوں میں ڈال دینا نہیں، بلکہ حکمت و تدبیر سے مناسب وقت اور مناسب ماحول دیکھ کر ایسے عنوان سے پہنچانا ہے کہ مخاطب کے لیے قبول کرنا آسان ہو جائے۔

دوسری چیز موعظت ہے جس کے معنی کسی کو ہمدردی و خیر خواہی کے ساتھ نیک کام کی طرف بلانے کے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ داعی کے لیے ضروری ہے کہ جو کلام کرے ہمدردی اور خیر خواہی کے جذبہ سے کرے۔ تیسری چیز موعظت کے ساتھ حسنہ کی

قید ہے اس میں اشارہ عنوان کو نرم اور دلنشیں بناتا ہے۔ کیونکہ بعض اوقات خالص ہمدردی وخیر خواہی سے کسی کو اس کی بھلائی کی طرف بلایا جاتا ہے، مگر عنوان اور لب ولہجہ دلخراش ہوتا ہے تو وہ دعوت بھی مؤثر نہیں ہوتی، اس لیے موعظت کے ساتھ حسنہ کی قید —— حاصل یہ کہ اس آیت نے دعوتِ پیغمبرانہ کے آداب میں ان تین چیزوں کو ضروری قرار دیا۔ اول حکمت وتدبر، اس کام کے لیے دعوت بے کار نہ ہو جائے، مؤثر ہو۔ دوسرے ہمدردی وخیر خواہی سے نیک کام کی دعوت۔ تیسرے اس دعوت کا عنوان اور لب ولہجہ نرم وقابلِ قبول ہو۔

آخر میں ایک چوتھی چیز یہ بتلائی گئی کہ اگر دعوت کو ان آداب کے ساتھ پیش کرنے پر بھی قبول نہ کیا جائے اور نوبت مجادلہ ہی کی آ جائے تو پھر عامیانہ انداز کا مجادلہ نہ ہونا چاہیے، بلکہ ﴿بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ﴾ یعنی اچھے طریقے پر ہونا چاہیے۔ ابن کثیرؒ نے اس کی تفسیر میں فرمایا: ''برفق ولین وحسن خطاب'' یعنی مجادلہ بھی نرمی، خیر خواہی اور حسن خطاب کے ساتھ ہونا چاہیے، اور تفسیر مظہری میں فرمایا کہ ''مجادلة بالتی ھی احسن'' یہ ہے کہ اس میں اپنا غصہ اتارنا یا اپنے نفس کی بڑائی پیش نظر نہ ہو، خالص اللہ تعالیٰ کے لیے کلمۂ حق کو بلند کرنے کے لیے ہو، اور مجادلہ بالتی ھی احسن صرف مسلمانوں کے لیے نہیں، بلکہ غیر مسلموں سے مجادلہ کی نوبت آئے تو اس میں بھی انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو اسی کی ہدایت کی گئی ہے۔ ایک آیت میں ارشاد ہے: ﴿وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَھْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ﴾ (العنکبوت:۴۶) یعنی کفار واہل کتاب سے مجادلہ کی نوبت آئے تو وہ بھی ﴿بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ﴾ یعنی نرمی، خیر خواہی اور حسنِ خطاب کے ساتھ ہونا چاہیے۔

انبیاء علیہم السلام کا اُسوۂ حسنہ

انبیاء علیہم السلام کے دعوت واصلاح کے واقعات جو قرآن وحدیث میں بے شمار آئے ہوئے ہیں، ان میں ایک ایک کو دیکھیے تو پوری عمر کی کوششوں کو اسی انداز پر پائیں گے۔

حضرت نوح علیہ السلام سو پچاس نہیں بلکہ نو سو برس تک جس قوم کو دعوت دیتے رہے اور ہمدردی وخیر خواہی سے سمجھاتے رہے' اس کے باوجود جب ان کی قوم نے بختی اور بے تہذیبی کا معاملہ کیا' ان کو گمراہ اور بے وقوف بتایا تو آپ کو معلوم ہے کہ اس رسول مقبولؑ نے کیا جواب دیا: ﴿يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ ضَلٰلَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝٦١﴾ (الاعراف) ''اے میری قوم کے لوگو! (میرے بھائیو!) مجھ میں کوئی گمراہی نہیں' بلکہ میں ربّ العالمین کی طرف سے رسول بنا کر (تمہاری بھلائی کے لیے) بھیجا گیا ہوں۔''

سرورِ کائنات ہمارے رسول اکرم ﷺ کی پوری زندگی کے واقعات اسی طرز کے شاہد ہیں۔ ہر طرح کی ایذائیں سہنے کے بعد بھی ظالموں سے انتقام لینے کا تو ذکر ہی کیا ہے' ان کے لیے بھی دعائے خیر کی جاتی۔ اِهْدِ قَوْمِيْ اِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ۔

جن حضراتِ علماء کو وراثت انبیاء کا کچھ حصہ ملا ہے' ان سب کا بھی دعوت وتبلیغ میں یہی حال رہا ہے۔ آخری دور میں حضرت سید اسماعیل شہید ؒ کا واقعہ ہے کہ دہلی کی جامع مسجد سے وعظ کر کے باہر آ رہے تھے کہ مسجد کی سیڑھیوں پر چند غنڈوں نے راستہ روکا اور کہا: ہم نے سنا ہے کہ آپ حرامی ہیں! مولانا نے نہایت طمانیت سے فرمایا کہ بھائی! آپ کو غلط خبر ملی ہے۔ میری والدہ کے نکاح کے گواہ اب تک زندہ موجود ہیں۔ وہ جانتے تھے کہ ان کا مقصد صرف گالی دینا اور ایذا پہنچانا ہے' مگر وارثِ انبیاء کا جو کام ہونا چاہیے وہ کیا' کہ ان کی گالی کو ایک مسئلہ بنا کر بات ختم کر دی۔

طریقِ نبوت اور ہم

حقیقت یہ ہے کہ دعوت واصلاح کا کام انبیاءؑ یا ان کے وارث ہی کر سکتے ہیں' جو قدم قدم پر اپنا خون پیتے ہیں اور دشمن کی خیر خواہی اور ہمدردی میں لگے رہتے ہیں۔ ان کی رفتار وگفتار میں کسی مخالف پر طعن وتشنیع کا شائبہ نہیں ہوتا' وہ مخالف کے جواب میں فقرے چست کرنے کی فکر نہیں کرتے' وہ ان پر الزام تراشی کا پہلو اختیار نہیں کرتے۔ اسی کا یہ اثر ہوتا ہے کہ چند روز کی مخالفتوں کے بعد بڑے بڑے سرکشوں کو ان کے سامنے

جھکنا پڑتا ہے' ان کی بات کو ماننا پڑتا ہے۔ آج افسوس یہ ہے کہ ہم اسوۂ انبیاء سے اتنی دور جا پڑے کہ ہمارے کلام و تحریر میں ان کی کسی بات کا رنگ نہ رہا۔ آج کل کے مبلغ و مصلح کا کمال یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ مخالف پر طرح طرح کے الزام لگا کر اس کو رسوا کرے اور فقرے ایسے چست کرے کہ سننے والا دل کو پکڑ کر رہ جائے۔ اسی کا نام آج کی زبان میں زبان دانی اور اردو ادب ہے۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ

اللہ تعالیٰ تو اپنے انبیاء کو جب مقامِ دعوت پر کھڑا کرتے ہیں تو موسیٰ و ہارون علیہما السلام جیسے اولوالعزم پیغمبروں کو فرعون جیسے سرکش کافر کی طرف بھیجنے کے وقت یہ ہدایت نامہ دے کر بھیجتے ہیں: ﴿فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى﴾ (طٰہٰ) ''پس فرعون سے بات نرم کرنا' شاید راستہ پر آ جائے اور اللہ تعالیٰ سے ڈر جائے''۔

آج ہمارے علماء اور مصلحین و مبلغین میں کوئی حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام سے زیادہ ہادی اور رہبر نہیں ہو سکتا اور ان کے مخاطب فرعون سے زیادہ گمراہ نہیں ہو سکتے' تو ان کے لیے کیسے روا ہو گیا کہ جس سے ان کا کسی رائے میں اختلاف ہو جائے تو اس کی پگڑی اُچھالیں اور ٹانگ کھینچنے کی فکر میں لگ جائیں' اور استہزاء و تمسخر کے ساتھ اس پر فقرے چست کریں! اور پھر دل میں خوش ہوں کہ ہم نے دین کی بڑی خدمت انجام دی ہے' اور لوگوں سے اس کے متوقع رہیں کہ ہماری خدمات کو سراہیں اور قبول کریں۔

میری نظر میں اس وقت یہ تین اسباب ہیں جو مسلمانوں کا شیرازہ بندھنے نہیں دیتے۔ ہر اجتماع کے نتیجے میں افتراق' ہر تنظیم کے نتیجہ میں تفریق' ہر اصلاح کے نتیجہ میں فساد اور ہر دعوت کے نتیجہ میں نفرت ہمارے سامنے آتی ہے۔ کاش ہم مل کر سوچیں اور دوسروں کی اصلاح سے پہلے اپنی اصلاح کی فکر کریں' کیونکہ اصل مرض یہی ہے کہ حبِ مال و جاہ اور حسد و بغض کی نجاستوں سے اپنے قلوب پاک نہیں۔ ہمیں اس پر بڑا ناز ہے کہ ہم چوری' رشوت' سود' شراب' رقص و سرود اور سینما سے پرہیز کرتے ہیں اور نماز روزے کے پابند ہیں۔ لیکن خطرہ یہ ہے کہ کہیں ہماری یہ نماز روزہ کی پابندی اور سود'

شراب، رقص وسرود سے پرہیز کہیں ایسا تو نہیں کہ صرف اپنی مولوی گری کے پیشہ کی خاطر ہو۔ کیونکہ اس پیشہ میں ان چیزوں کی کھپت نہیں، ورنہ اگر ہم ان چیزوں میں سے خالص خوفِ خدا کی بنا پر بچے ہوتے تو حبِّ مال وجاہ، حسد وبغض، کبر وریا سے بھی بچے ہوتے، کیونکہ ان کی نجاست کچھ سود وشراب سے کم نہیں، مگر یہ باطنی گناہ ہمارے جُبے اور عمامے کے ساتھ جمع ہو سکتے ہیں اس لیے ان کی پرواہ نہیں ہوتی، اور یہی وہ چیزیں ہیں جو دراصل سارے تفرقوں کی بنیاد ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان سب آفتوں سے بچنے کی توفیقِ کامل عطا فرمائے، تاکہ ہم ایک دل ہو کر دعوت واصلاح کا کام پیغمبرانہ جذبہ اور پیغمبرانہ آداب کے ساتھ لے کر کھڑے ہو جائیں۔

خلاصہ کلام

اہل نظر وفکر سے یہ بات مخفی نہیں کہ اس وقت دنیا کے ہر خطے اور ہر ملک میں مسلمان جن مصائب اور آفات میں مبتلا ہیں، ان کا سب سے بڑا سبب آپس کا تفرقہ اور خانہ جنگی ہے۔ ورنہ عددی اکثریت اور مادی اسباب کے اعتبار سے پوری تاریخ اسلام میں کسی وقت بھی مسلمانوں کو اتنی عظیم طاقت حاصل نہیں تھی جتنی آج ہے۔

اور اس تفرقہ کے اسباب پر جب غور کیا جاتا ہے تو اس کا سبب خدا اور آخرت سے غفلت اور دوسری قوموں کی طرح صرف دنیا کی چندروزہ مال ودولت اور عزت وجاہ کی ہوس بے لگام ہے، جو ہمارے معاشرہ میں کبھی سیاسی اقتدار کے لیے کشمکش، تجارتی اور صنعتی ریس، عہدوں اور منصبوں کی خاطر باہمی تصادم کی صورت میں ہمارے معاشرہ کو پارہ پارہ کرتی ہے اور کبھی مذہبی اور دینی نظریات کی آڑ اور مختلف نظاموں کے روپ میں ایک دوسرے کے خلاف اہانت واستہزاء کا ذریعہ بن جاتی ہے، ورنہ اگر اجتہادی نظریات کے باہمی اختلاف کے باوجود صحابہ وتابعین کی طرح ہماری جنگ کا رُخ صرف کفر والحاد اور بے دینی کی طرف ہو جائے تو اس کے مقابلہ میں مسلمانوں کی مختلف جماعتیں ایک صف اور ایک بنیانِ مرصوص نظر آئیں۔

ذمہ دار علماء سے دردمندانہ گزارش

سیاسی اور اقتصادی میدان اور اعزاز و منصب کی دوڑ میں بے اعتدالیوں کی روک تھام تو سرِ دست ہمارے بس میں نہیں، لیکن خود دین و مذہب کے لیے کام کرنے والی جماعتوں کے نظریاتی اور نظامی اختلافات اشتراکِ مقصد کی خاطر معتدل کیے جا سکتے ہیں۔ اگر ہم اسلام کے بنیادی اصول کی حفاظت اور الحاد و بے دینی کے سیلاب کی مدافعت کے اہم مقصد کو صحیح معنی میں مقصد اصلی سمجھ لیں تو یہ وہ نقطۂ وحدت ہے کہ جس پر مسلمانوں کے سارے فرقے اور ساری جماعتیں جمع ہو کر کام کر سکتی ہیں اور اسی وقت اس سیلاب کے مقابلہ میں کوئی مؤثر کام انجام پا سکتا ہے۔

لیکن حالات کا جائزہ یہ بتاتا ہے کہ یہ مقصد اصلی ہی ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا ہے، اس لیے ہماری توانائی اور علم و تحقیق کا زور آپس کے اختلافی مسائل پر صرف ہوتا ہے، وہی ہمارے جلسوں، وعظوں، رسالوں اور اخباروں کا موضوع بحث بنتے ہیں۔ ہمارے اس عمل سے عوام یہ سمجھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ دین اسلام صرف ان دو چیزوں کا نام ہے اور جس رُخ کو انہوں نے اختیار کر لیا ہے اس کے خلاف کو گمراہی اور اسلام دشمنی سے تعبیر کرتے ہیں، جس کے نتیجہ میں ہماری وہ طاقت جو کفر و الحاد اور بے دینی اور معاشرہ میں بڑھتی ہوئی بے حیائی کے مقابلہ پر خرچ ہوتی، آپس کی جنگ و جدل میں خرچ ہونے لگتی ہے۔ اسلام و ایمان ہمیں جس محاذ پر لڑنے اور قربانی دینے کے لیے پکارتا ہے، وہ محاذ دشمنوں کی یلغار کے لیے خالی پڑا نظر آتا ہے۔ ہمارا معاشرہ سماجی برائیوں سے پُر ہے، اعمال و اخلاق برباد ہیں، معاملات و معاہدات میں فریب ہے۔ سود، قمار بازی، شراب، خنزیر، بے حیائی اور بدکاری ہماری زندگی کے ہر شعبہ پر چھا گئے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ انبیاء کے جائز وارث اور ملک و ملت کے نگہبانوں کو آج بھی اپنے سے نظریاتی اختلاف رکھنے والوں پر جتنا غصہ آتا ہے اس سے آدھا بھی ان خدا کے باغیوں پر کیوں نہیں آتا؟ اور آپس کے نظریاتی اختلاف کے وقت جس جوشِ ایمانی کا اظہار ہوتا ہے وہ

ایمان کے اس اہم محاذ پر کیوں ظاہر نہیں ہوتا؟ ہمارا زورِ زبان اور زورِ قلم جس شان سے اپنے اختلافی مسائل میں جہاد کرتا ہے' اس کا کوئی حصہ سرحدات اور اصولِ ایمانی پر ہونے والی یلغار کے مقابلہ میں کیوں صرف نہیں ہوتا؟ مسلمانوں کو مرتد بنانے والی کوششوں کے بالمقابل ہم سب بنیانِ مرصوص کیوں نہیں بن جاتے؟

آخر ہم اس پر غور کیوں نہیں کرتے کہ بعثتِ انبیاء اور نزولِ قرآن کا وہ مقصدِ عظیم جس نے دنیا میں انقلاب برپا کیا' اور جس نے اولادِ آدم کو بہیمیت سے نکال کر انسانیت سے سرفراز کیا' اور جس نے ساری دنیا کو اسلام کا حلقہ بگوش بنایا' کیا وہ صرف یہی مسائل تھے جن میں ہم اُلجھ کر رہ گئے ہیں؟' اور کیا دوسروں کو ہدایت پر لانے کا طریق اور پیغمبرانہ دعوت کا یہی عنوان تھا جو آج ہم نے اختیار کر رکھا ہے؟))

﴿اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِکْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ﴾

(الحدید:۱۶)

''کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ ایمان والوں کے دل اللہ کے ذکر اور اس کے نازل کیے ہوئے حق کی طرف جھک جائیں؟''

آخر وہ کون سا وقت آئے گا جب ہم اپنے نظریاتی اور نظامی مسائل سے ذرا آگے بڑھ کر اصولِ اسلام کی حفاظت اور بگڑے ہوئے معاشرہ کی اصلاح کو اپنا اصلی فرض سمجھیں گے' ملک میں عیسائیت اور کمیونزم کے بڑھتے ہوئے سیلاب کی خبر لیں گے' قادیانیت کے انکارِ حدیث اور تحریفِ دین کے لیے قائم شدہ اداروں کا پیغمبرانہ دعوت واصلاح کے ذریعے مقابلہ کریں گے؟

اور اگر ہم نے یہ نہ کیا اور محشر میں ہمارے ماویٰ اور ملجأ رسول کریم ﷺ نے ہم سے یہ سوال فرما لیا کہ میری شریعت اور میرے دین پر یہ حملے ہو رہے تھے' اسلام کے نام پر کفر پھیلایا جا رہا تھا' میری اُمت کو میرے دشمنوں کی اُمت بنانے کی کوشش مسلسل جاری تھی' قرآن وسنت کی کھلے طور پر تحریف کی جا رہی تھی' خدا اور رسولؐ کی نافرمانی اعلانیہ کی جا رہی تھی' تو تم مدعیانِ علم کہاں تھے؟ تم نے اس کے مقابلے پر کتنی محنت اور قربانی

پیش کی؟ کتنے بھٹکے ہوئے لوگوں کو راستے پر لگایا؟ تو آج ہمیں سوچ لینا چاہیے کہ ہمارا جواب کیا ہوگا۔

راہِ عمل

اس لیے ملت کا درد اور اسلام و ایمان کے اصول و مقاصد پر نظر رکھنے والے حضراتِ علماء سے میری دردمندانہ گزارش یہ ہے کہ مقصد کی اہمیت اور نزاکت کو سامنے رکھیں۔ سب سے پہلے تو اپنے دلوں میں اس کا عہد کریں کہ اپنی علمی و عملی صلاحیت اور زبان و قلم کے زور کو زیادہ سے زیادہ اس محاذ پر لگائیں گے جس کی حفاظت کے لیے قرآن وحدیث آپ کو بلا رہے ہیں۔

(۱) علماءِ کرام! اس بات کا عہد بھی کیجیے اور فیصلہ بھی کہ اس کام کے لیے اپنے موجودہ مشاغل میں سے سب سے زیادہ وقت نکالیں گے۔ (۲) دوسرے یہ کہ آپس کے نظریاتی اور اجتہادی اختلاف کو صرف اپنے اپنے حلقۂ درس' تصنیف وتالیف اور فتویٰ تک محدود رکھیں گے۔ عوامی جلسوں' اخباروں' اشتہاروں' باہمی مناظروں اور جھگڑوں کے ذریعے ان کو نہ اچھالیں گے۔ ان حلقوں میں بھی پیغمبرانہ اصولِ دعوت واصلاح کے تابع دلخراش عنوان اور طعن و تشنیع' استہزاء و تمسخر اور صحافیانہ فقرہ بازی سے گریز کریں گے۔ (۳) تیسرے یہ کہ معاشرہ میں پھیلی ہوئی بیماریوں کی اصلاح کے لیے دل نشین عنوان اور مشفقانہ لب ولہجہ کے ساتھ کام شروع کر دیں گے۔ (۴) چوتھے یہ کہ الحاد و بے دینی اور تحریفِ قرآن وسنت کے مقابلہ کے لیے پیغمبرانہ اصولِ دعوت کے تحت حکیمانہ تدبیروں' مشفقانہ وناصحانہ بیانوں اور دلنشین دلائل کے ذریعہ مجادلہ بالتی ھی احسن کے ساتھ اپنے زورِ بیان اور زورِ قلم کو وقف کر دیں گے۔

میں جو کچھ کہہ گیا ہوں' افسوس کہ نہ میرا منصب تھا نہ علماء کرام کے سامنے مجھے ایسی جرأت کرنا چاہیے تھی' مگر دکھی دل کے کچھ کلمات ہیں جو زبان پر آ گئے۔ میرے محترم بزرگ مجھے معاف فرمائیں اور اگر ان باتوں میں کوئی مفید پہلو ہے تو وہ خود اُن کا اپنا کام

ہے اس کو اختیار فرمائیں۔ مجھے امید ہے کہ اگر حضرات علماء اس طرف متوجہ ہو گئے اور کام شروع کیا تو اللہ تعالیٰ کا وعدہ ﴿اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ﴾ (محمد:۷) یعنی ''اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا'' آنکھوں سے پورا ہوتا ہوا مشاہدہ کریں گے۔

﴿اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ۭ وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ ۭ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ ﴾ (ھود)

حواشی

(۱) جامع العلم، ص ۸۰۔

(۲) جامع بیان العلم لابن عبد البر، ج۲، ص ۸۳۔

(۳) جامع بیان العلم۔

(٤) اوجز المسالك شرح موطأ مالك، ج۱، ص۱۵، محمد بن عبد الرحمن صیرفی۔

(٥) جامع بیان العلم، ج۲، ص۸۳۔

(٦) جامع بیان العلم، ج۲، ص ۸٤۔

(۷) جامع بیان العلم، ج۲، ص۷۳۔

(۸) جامع بیان العلم، ج۲، ص۷۳۔

(۹) جامع العلم، ج۲، ص۸٤۔

اختلافاتِ اُمت اور اُن کا حل

مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے ایک دوسرے موقع پر ''اختلافاتِ اُمت اور اُن کا حل'' کے عنوان سے تقریر فرمائی جو فی الحقیقت ''وحدتِ اُمت'' کے تتمہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس مناسبت سے اس تقریر کو بھی ''وحدتِ اُمت'' کے خطاب کے ساتھ ہی شائع کیا جارہا ہے' تاکہ بات مکمل ہو جائے اور مرض و علاج دونوں کی تفصیلات بیک وقت سامنے آجائیں۔ (ع۔ا)

شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب قدس اللہ سرہ مالٹا کی چار سالہ جیل سے رہائی کے بعد دار العلوم دیو بند میں تشریف لائے تو علماء کے ایک مجمع کے سامنے آپ نے ایک اہم بات ارشاد فرمائی۔

جو لوگ حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے واقف ہیں' وہ اُس سے بھی بے خبر نہیں ہیں کہ ان کی یہ قید و بند عام سیاسی لیڈروں کی قید نہ تھی۔ جنگِ آزادی میں اس درویش کی ساری تحریکات صرف رضائے حق سبحانہٗ وتعالیٰ کے لیے اُمت کی صلاح و فلاح کے گرد گھومتی تھیں۔ مسافرت اور انتہائی بے کسی کے عالم میں گرفتاری کے وقت جملہ جو اُن کی زبانِ مبارک پر آیا تھا' ان کے عزم اور مقاصد کا پتا دیتا ہے۔ فرمایا: ''الحمد للہ بمصیبتے گرفتارم نہ بمعصیتے''۔

جیل کی تنہائی میں ایک روز بہت مغموم دیکھ کر بعض رفقاء نے کچھ تسلی کے الفاظ کہنا چاہے تو فرمایا: ''اس تکلیف کا کیا غم ہے جو ایک دن ختم ہو جانے والی ہے' غم اس کا ہے کہ یہ تکلیف و محنت اللہ تعالیٰ کے نزدیک قبول ہے یا نہیں''۔

مالٹا کی قید سے واپس آنے کے بعد ایک رات بعد عشاء دار العلوم میں تشریف فرما تھے۔ علماء کا بڑا مجمع سامنے تھا۔ اس وقت فرمایا کہ ''ہم نے تو مالٹا کی زندگی میں دو سبق

سیکھے ہیں''۔ یہ الفاظ سن کر سارا مجمع ہمہ تن گوش ہو گیا کہ اس استاذ العلماء درویش نے اسی سال علماء کو درس دینے کے بعد آخر عمر میں جو سبق سیکھے ہیں وہ کیا ہیں۔ فرمایا کہ:

''میں نے جہاں تک جیل کی تنہائیوں میں اس پر غور کیا کہ پوری دنیا میں مسلمان دینی اور دُنیوی ہر حیثیت سے کیوں تباہ ہو رہے ہیں تو اس کے دو سبب معلوم ہوئے۔ ایک ان کا قرآن کو چھوڑ دینا' دوسرے ان کے آپس کے اختلافات اور خانہ جنگی۔ اس لیے میں وہیں سے یہ عزم لے کر آیا ہوں کہ اپنی باقی زندگی اس کام میں صرف کروں کہ قرآن کریم کو لفظاً و معناً عام کیا جائے' بچوں کے لیے لفظی تعلیم کے مکاتب ہر بستی بستی میں قائم کیے جائیں' بڑوں کو عوامی درسِ قرآن کی صورت میں اس کے معانی سے روشناس کرایا جائے اور قرآنی تعلیمات پر عمل کے لیے آمادہ کیا جائے' اور مسلمانوں کے باہمی جنگ و جدال کو کسی قیمت پر برداشت نہ کیا جائے''۔

نباضِ اُمت نے ملت مرحومہ کے مرض کی جو تشخیص اور تجویز فرمائی تھی' باقی ایامِ زندگی میں ضعف و علالت اور ہجوم مشاغل کے باوجود اس کے لیے سعیِ پیہم فرمائی۔ بذاتِ خود درسِ قرآن شروع کرایا' جس میں تمام علمائے شہر اور حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ جیسے علماء بھی شریک ہوتے تھے اور عوام بھی۔ اس ناکارہ کو اس درس میں شرکت کا شرف حاصل رہا ہے۔ مگر اس واقعے کے بعد حضرتؒ کی عمر ہی گنتی کے چند ایام تھے۔ ع آں قدح بہ شکست و آں ساقی نماند

آج بھی مسلمان جن بلاؤں میں مبتلا اور جن حوادث و آفات سے دوچار ہیں' اگر بصیرت سے کام لیا جائے تو ان کے سب سے بڑے سبب یہی دو ثابت ہوں گے' قرآن کو چھوڑنا اور آپس میں لڑنا۔ غور کیا جائے تو یہ آپس کی لڑائی بھی قرآن کو چھوڑنے ہی کا لازمی نتیجہ ہے۔ قرآن پر کسی درجے میں بھی عمل ہوتا تو خانہ جنگی یہاں تک نہ پہنچتی۔

اختلافِ رائے کے حدود

اختلاف رائے کچھ مذموم نہیں‘ اگر اپنی حدود کے اندر ہو۔ انسان کی فطرت میں اس کے پیدا کرنے والے نے عین حکمت کے مطابق ایک مادہ غصہ اور مدافعت کا بھی رکھا ہے اور وہ انسان کی بقاء وارتقاء کے لیے ضروری ہے‘ مگر یہ مادہ دشمن کی مدافعت کے لیے رکھا ہے۔ اگر اس کا رُخ دوسری طرف ہو جائے‘ خواہ اس کے لیے دشمن کو پہچاننے اور متعین کرنے میں غلطی ہوگئی ہو یا کسی دوسری وجہ سے‘ بہرحال جب دشمن کا رُخ بدلے گا تو یہ خود اپنی تباہی کا ذریعہ بنے گا۔ اسی لیے قرآن کریم نے مؤمن کے لیے پوری وضاحت کے ساتھ اس کا رُخ متعین فرما دیا ہے: ﴿اِنَّ الشَّیْطٰنَ لَکُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْہُ عَدُوًّا﴾ (فاطر: ٦) ”یقیناً شیطان تمہارا دشمن ہے‘ اس کو ہمیشہ دشمن سمجھتے رہو“۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ مؤمن کے غصے اور لڑائی کا مصرفِ صحیح صرف شیطان اور شیطانی طاقتیں ہیں۔ جب اس کی جنگ کا رُخ اس طرف ہوتا ہے تو وہ جنگ قرآن کی اصطلاح میں جہاد کہلاتی ہے جو اعظم عبادات میں سے ہے۔ حدیث میں فرمایا ہے: ((ذِرْوَۃُ سَنَامِہِ الْجِھَادُ)) یعنی ”اسلام میں سب سے اعلیٰ کام جہاد ہے“۔ لیکن اگر اس جنگ کا رُخ ذرا اس طرف سے ہٹا تو یہ جہاد کے بجائے فساد کہلاتی ہے‘ جس سے بچانے کے لیے اللہ اور رسول اور کتابیں آئی ہیں۔ شکل و صورت کے اعتبار سے جہاد اور فساد میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ وہ کانٹا‘ جہاں سے یہ لائنیں بدلتی ہیں صرف یہ ہے کہ اس کا رُخ شیطان اور شیطانی طاقتوں کی طرف ہے تو جہاد ہے ورنہ فساد۔ دو قومی نظریہ‘ جس نے پاکستان بنوایا‘ اسی اجمال کی عملی تفصیل تھی کہ کلمۂ اسلام کے ماننے والے ایک متحد قوم ہیں اور نہ ماننے والے دوسری قوم۔ ان کے جہاد کا رُخ اس طرف ہونا چاہیے۔

حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ نے جہاد کے فرض ہونے کی ایک حکمت یہ بھی بیان فرمائی کہ قہر و غضب اور مدافعت کا مادہ‘ جو انسانی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے‘ جب جہاد کے ذریعے اپنا صحیح مصرف پالیتا ہے تو آپس کی خانہ جنگی اور فساد سے خود بخود نجات

ہو جاتی ہے' ورنہ اس کی مثال ایسی ہوتی ہے کہ جس چھت پر بارش کا پانی نکلنے کا راستہ پرنالوں کے ذریعے نہ بنایا جائے تو پھر یہ پانی چھت کو توڑ کر اندر آتا ہے۔

صلح اور جنگ کس سے؟

آج اگر غور کیا جائے تو پورے عالم اسلام پر یہی مثال صادق آتی ہے۔ شیطان اور شیطانی تعلیم' کفر والحاد' خدا اور رسول سے بغاوت اور فحاشی وعیاشی سے طبیعتیں مانوس ہو رہی ہیں۔ ان کی نفرت دلوں سے نکل چکی ہے' اس پر کسی کو غصہ نہیں آتا۔ انسانی رواداری' اخلاق' مروّت کا سارا زور کفر والحاد اور ظلم کی حمایت میں صرف ہوتا ہے۔ نفرت' بغاوت اور عداوت کا میدان خود اپنے اعضاء وجوارح کی طرف ہے۔ آپس میں ذرا ذرا سی بات پر جھگڑا لڑائی ہے' چھوٹا سا نقطۂ اختلاف ہو تو اس کو بڑھا کر پہاڑ بنا دیا جاتا ہے۔ اخبارات ورسائل کی غذا یہی بن کر رہ گئی ہے۔ دونوں طرف سے اپنی پوری توانائی اس طرح صرف کی جاتی ہے کہ گویا جہاد ہو رہا ہے۔ دو متحارب طاقتیں لڑ رہی ہیں اور کوئی خدا کا بندہ اپنی طرف نظر کر کے نہیں دیکھتا کہ ع

''ظالم جو بہہ رہا ہے وہ تیرا ہی گھر نہ ہو!''

سیاستِ ممالک سے لے کر خاندانی اور گھریلو معاملات تک سب میں اسی کا مظاہرہ ہے۔ جہاں دیکھو ﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ﴾ کا سبق پڑھنے والے آپس میں گتھم گتھا ہیں۔ قرآنِ حکیم نے جہاں عفو ودرگزر اور حلم وبردباری کی تلقین کی تھی' وہاں جنگ ہو رہی ہے' اور جس محاذ پر جہاد کی دعوت دی تھی وہ محاذ دشمنوں کی یلغار کے لیے خالی پڑا ہے۔ فالی اللّٰہ المشتکی وانا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔

اسمبلیوں' کونسلوں' میونسپل بورڈوں کی نشست' حکومت کے عہدوں اور ملازمتوں کی دوڑ' صنعت وتجارت میں مقابلہ اور کمپی ٹیشن' جائیدادوں اور زمینداروں کی کشمکش جہاں خالص اپنے حقوق کی جنگ ہے' جس کو چھوڑ بیٹھنا سب کے نزدیک ایثار اور اعلیٰ اخلاق کا ثبوت ہے' وہاں کوئی ایک انچ اپنی جگہ سے سرکنے کو تیار نہیں۔ دین ومذہب کے

نام پر کام کرنے والوں کی اول تو تعداد ہی کم ہے اور جو ہے وہ عموماً قرآن و سنت کی بنیادی تعلیمات سے اغماض کر کے جزوی اور فروعی مسائل میں الجھ کر رہ گئی ہے۔ چھوٹے سے چھوٹا مسئلہ معرکۂ جدال بنا ہوا ہے' جس کے پیچھے غیبت' جھوٹ' ایذائے مسلم' افتراء و بہتان اور تمسخر و استہزاء جیسے متفق علیہ کبیرہ گناہوں کی بھی پرواہ نہیں کی جاتی۔ دین کے نام پر خدا کے گھروں میں جدال و قتال اور لڑائیاں ہیں۔ نوبت پولیس اور عدالتوں تک پہنچی ہوئی ہے۔

ان دین داروں کو خدا اور رسول پر استہزاء کرنے والوں' شراب پینے والوں' سود اور رشوت کھانے والوں سے وہ نفرت نہیں جو ان مسائل میں اختلاف رکھنے والوں سے ہے۔ کوئی خدا کا بندہ اس پر نظر نہیں کرتا کہ اس مثبت و منفی دونوں پہلوؤں میں کوئی بھی کسی کے نزدیک ایسا نہیں جس کے لیے مسلمانوں سے جنگ کرنا جائز ہو' جس کے لیے دوسروں کی غیبت و بہتان' تذلیل و تحقیر روا ہو۔

اصلاحِ حال کی ایک غلط کوشش

ہمارے نو تعلیم یافتہ روشن خیال مصلحین کی توجہ جب اس باہمی اختلاف کے مہلک نتائج کی طرف جاتی ہے اور اس کے علاج کی فکر ہوتی ہے' تو ان کے خیال میں ساری خرابیاں صرف ان اختلافات میں نظر آتی ہیں جو دین و مذہب کے نام پر سامنے آتے ہیں اور وہ صرف اسی اختلاف کو مٹانے کے لیے علاج سوچتے ہیں۔ وہ اس وقت ان سب لڑائیوں کو بھول جاتے ہیں جو خالص نفسانی اور ذاتی غرض کے لیے لڑی جارہی ہیں' جن کے لیے ایک دوسرے کی جان' آبرو اور مال سب کچھ حلال سمجھ لیا جاتا ہے' جس کے پیچھے پورے ملک میں باہمی منافرت کے سیلاب اُمنڈتے ہیں۔ مگر ان کو چونکہ نئی تہذیب و شرافت کا نام دے دیا ہے' اس لیے نہ وہ قوم کے لیے کوئی مرض رہا اور نہ اس کا علاج سوچنے کی ضرورت رہی۔ اختلاف و لڑائی میں صرف ملا بدنام ہے۔ اسی کا علاج زیر غور ہے۔ حالانکہ دین و مذہب کے نام پر جو اختلافات ہیں' اگر غور کیا جائے تو ان کی خرابی

صرف حدود سے تجاوز کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے' ورنہ وہ کوئی برادری کا نوتہ نہیں بن سکتے۔ وہ اپنے ذاتی حقوق نہیں جنہیں ایثار کیا جا سکے' بلکہ قرآن وسنت کی تعبیر کے اختلافات ہیں جن کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔

ہمارے بعض روشن خیال مصلحین نے سارا فساد انہی اختلافات میں منحصر سمجھ کر اس کا یہ علاج تجویز کیا کہ فرقہ وارانہ اختلافات کو ہٹا کر سب کا ایک نیا اور مشترک مذہب بنا لیا جائے۔ پوری قوم کا وہی ایک مذہب ہو' تا کہ اختلاف کی بنیاد ہی ختم ہو جائے۔ مگر یہ بات مذہبی مسائل میں عقلاً صحیح ہے نہ عملاً ممکن۔ ہاں خالص دُنیوی معاملات میں جن میں جھگڑا ذاتی حقوق ہی کا ہو' وہاں اپنے اپنے مطالبات کو نظر انداز کر کے ایسی صلح کی جا سکتی ہے' اس لیے باہمی جنگ وجدل کا علاج یہ نہیں کہ اختلافِ رائے کو مٹا کر سب کو ایک نظریے کا پابند کر دیا جائے۔

اختلافِ رائے اور جھگڑے فساد میں فرق

اہل عقل وبصیرت پر مخفی نہیں کہ دینی اور دُنیوی دونوں قسم کے معاملات میں بہت سے مسائل ایسے آتے ہیں جن میں رائیں مختلف ہو سکتی ہیں۔ ان میں اختلاف کرنا عقل و دیانت کا عین مقتضیٰ ہوتا ہے۔ ان میں اتفاق صرف دو صورتوں سے ہو سکتا ہے' یا تو مجمع میں کوئی اہل بصیرت اور اہل رائے نہ ہو۔ ایک نے کچھ کہہ دیا سب نے مان لیا اور یا پھر جان بوجھ کر کسی کی رعایت اور مروّت سے اپنے ضمیر اور اپنی رائے کے خلاف دوسرے کی بات پر صاد کر دیا۔ ورنہ اگر عقل و دیانت دونوں موجود ہوں تو رائے کا اختلاف ضروری ہے' اور یہ اختلاف کبھی کسی حال پر مضر بھی نہیں ہوتا' بلکہ دوسروں کے لیے بصیرت کا سامان مہیا کرتا ہے۔ اسمبلیوں میں حزبِ اختلاف کو اسی بنیاد پر ضروری سمجھا جاتا ہے۔

قرآن وسنت کے مجملات اور مبہمات کی تشریح وتعبیر میں اسی طرح کے اختلافات کو ''رحمت'' کہا گیا ہے' جو اسلام کے عہد اوّل سے صحابہ وتابعین اور پھر ائمہ مجتہدین میں چلے آئے ہیں۔ ان مسائل میں جو اختلافات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں پیش آ چکے ہیں' ان کو

مٹانے کے معنی اس کے سوا نہیں ہو سکتے کہ صحابہ کرامؓ کی کسی ایک جماعت کو باطل پر قرار دیا جائے' جو نصوصِ حدیث اور ارشاداتِ قرآنی کے بالکل خلاف ہے۔ اسی لیے حافظ شمس الدین ذہبیؒ نے فرمایا ہے کہ جس مسئلے میں صحابہ کرامؓ کے درمیان اختلاف ہو چکا ہے' اس کو بالکل ختم کر دینا ممکن نہیں۔

صحابہؓ اور ائمہ مجتہدینؒ کا طرزِ عمل

اسی کے ساتھ صحابہ و تابعین اور ائمہ مجتہدین کے دور کی وہ تاریخ بھی سامنے رکھنا ضروری ہے کہ تعبیر کتاب وسنت کے ماتحت جو ان میں اختلافِ رائے پیش آیا ہے' اس پوری تاریخ میں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں کہ اس نے جنگ وجدال کی صورت اختیار کی ہو۔ باہمی اختلاف مسائل کے باوجود ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھنا اور تمام برادرانہ تعلقات قائم رہنا اس پوری تاریخ کا اعلیٰ شاہکار ہے۔ سیاسی مسائل میں ''مشاجراتِ صحابہؓ'' کا فتنہ'' تکوینی حکمتوں کے ماتحت پیش آیا' آپس میں تلواریں بھی چل گئیں' مگر عین اسی فتنہ کی ابتدا میں جب امام مظلوم حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ باغیوں کے نرغے میں محصور تھے اور یہی باغی نمازوں میں امامت کراتے تھے' تو امامِ مظلوم نے مسلمانوں کو ان کی اقتدا میں نماز پڑھنے کی ہدایت فرمائی اور عام ضابطہ یہ بتا دیا کہ **اذا هم احسنوا فاحسن معهم وان هم اساء وا فاجتنب اساء تهم** یعنی ''جب وہ لوگ کوئی نیک کام کریں اس میں ان کے ساتھ تعاون کرو' اور جب کوئی برا کام اور غلط کام کریں تو اس سے اجتناب کرو''۔ اس ہدایت کے ذریعے اپنی جان پر کھیل کر مسلمانوں کو قرآنی ارشاد: ﴿تَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾ کی صحیح تفسیر بتا دی اور باہمی انتشار وافتراق کا دروازہ بند کر دیا۔

اور اسی فتنے کے آخر میں جب کہ حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کے درمیان میدانِ جنگ گرم تھا' روم کی عیسائی سلطنت کی طرف سے موقع پا کر حضرت معاویہؓ کو اپنے ساتھ ملانے اور ان کی مدد کرنے کا پیغام ملا تو حضرت معاویہؓ کا جواب یہ تھا کہ:

''ہمارے اختلاف سے دھوکہ نہ کھاؤ۔ اگر تم نے مسلمانوں کی طرف رُخ کیا تو علیؓ کے لشکر کا پہلا سپاہی' جو تمہارے مقابلے کے لیے نکلے گا' وہ معاویہ ہوگا''۔ معلوم یہ ہوا کہ باہمی اختلاف جو منافقین کی گہری سازشوں سے تشدد کا رُخ اختیار کر چکا ہے' اس میں بھی اسلام کے بنیادی حقائق کسی کی نظر سے اوجھل نہیں ہوئے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ تعبیر کتاب وسنت کے ماتحت اختلافِ رائے جو صحابہ' تابعینؒ اور ائمہ مجتہدینؒ میں رہا ہے تو وہ بلاشبہ رحمت ہی ہے۔ اس کا کوئی پہلو نہ پہلے مسلمانوں کے لیے مضر ثابت ہوا اور نہ آج ہو سکتا ہے' بشرطیکہ وہ انہی حدود کے اندر رہے جن میں ان حضرات نے رکھا تھا کہ ان کا اثر نماز' جماعت' امامت اور معاشرت کے کسی معاملے پر نہ پڑتا تھا۔

جدال اور اصلاح

مذہب کے نام پر دوسرے اختلافات قرونِ اولیٰ کے بعد بدعت وسنت اور دوسرے عنوانات سے پیدا ہوئے۔ بہت سے لوگوں نے قرآن وسنت کی تعبیر میں اصولِ صحیحہ کو چھوڑ کر ذاتی آراء کو امام بنا لیا اور نئے نئے مسائل پیدا کر دیے۔ یہ اختلافات بلاشبہ وہ تفریق وافتراق تھے جن سے قرآن وسنت میں مسلمانوں کو ڈرایا گیا ہے۔ ان کو ختم یا کم کرنے کی کوشش بلاشبہ مفید تھی' مگر قرآن حکیم نے اس کا بھی ایک خاص طریقہ بتا دیا ہے' جس کے ذریعے تفریق کی خلیج کم ہوتی چلی جائے' بڑھنے نہ پائے۔ یہ وہ اصولِ دعوت الی الخیر ہیں جن میں سب سے پہلے حکمت وتدبیر سے اور پھر خیر خواہی وہمدردی اور نرم عنوان سے لوگوں کو قرآن وسنت کے صحیح مفہوم کی طرف بلانا ہے اور آخر میں مجادلہ بالتی ھی احسن یعنی حجت ودلیل کے ساتھ افہام وتفہیم کی کوشش ہے۔

افسوس ہے کہ آج کل عام اہل علم اور مصلحین نے ان اصول کو نظر انداز کر دیا۔ صرف جدال میں اور وہ بھی غیر مشروط انداز سے' مشغول ہو گئے کہ اپنے حریف کا استہزاء وتمسخر اس کو زیر کرنے کے لیے جھوٹے' سچے' ناجائز اور جائز ہر طرح کے حربے

استعمال کرنا اختیار کرلیا' جس کالازمی نتیجہ جنگ وجدال اور جھگڑاوفساد تھا۔

اختلافات کی خرابیوں کا وقتی علاج

آج جب کہ مسلمانوں کا تفرق انتہا کو پہنچا ہوا ہے' اپنی مزعومات کے خلاف کوئی کسی کی بات ماننے' بلکہ سننے کے لیے بھی تیار نہیں اور کوئی ایسی قوت نہیں کہ کسی فریق کو مجبور کر سکے' تو اس باہمی جنگ وجدال اور اس کے مہلک اثرات سے اسلام اور مسلمانوں کو بچانے کا صرف ایک راستہ ہے کہ فرقوں اور جماعتوں کے ذمہ دار ذرا اس پر غور کریں کہ جن مسائل میں ہم جھگڑ رہے ہیں' کیا وہی اسلام کے بنیادی مسائل ہیں جن کے لیے قرآن نازل ہوا' رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے' آپؐ نے اپنی زندگی اُن کے لیے وقف کردی' اور ان کے پیچھے ہر طرح کی قربانیاں دیں؟ یا بنیادی مسائل اور قرآن و اسلام کا اصلی مطالبہ کچھ اور ہے؟

جس ملک میں ایک طرف عیسائی مشنریاں پوری قوت اور چمک دمک کے ساتھ اس کو عیسائی ملک بنانے کے خواب دیکھ رہی ہیں' ایک طرف کھلے بندوں خدا اور رسولؐ اور ان کی تعلیمات کا مذاق اڑایا جاتا ہے' ایک طرف قرآن اور اسلام کے نام پر وہ سب کچھ کیا جارہا ہے جس کو دنیا سے مٹانے ہی کے لیے قرآن اور اسلام آئے تھے' اس جگہ صرف فروعی مسائل اور ان کی تحقیق وتنقید وترویج کی کوششوں میں الجھ کر ان بنیادی مہمات سے غفلت برتنے والوں سے اگر اللہ تعالیٰ ورسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یہ مطالبہ ہو کہ ہمارے دین پر یہ افتادیں پڑ رہی تھیں' تم نے اس کے لیے کیا کیا؟ تو ہمارا کیا جواب ہوگا؟ مجھے یقین ہے کہ کوئی فرقہ اور کوئی جماعت جب ذرا اپنے جھگڑوں سے بلند ہو کر سوچے گی تو اس کو اپنی موجودہ مصروفیات پر ندامت ہوگی' اور اس کی کوشش کا رُخ بدلے گا۔ اس کے نتیجے میں باہمی آویزش یقیناً کم ہوگی۔

میں اس وقت کسی کو یہ نہیں کہتا کہ وہ اپنے خیالات ومزعومات کو بدلے۔ گزارش صرف اتنی ہے کہ اپنی توانائی صَرف کرنے کا محل تلاش کر کے اس پر لگادیں اور باہمی

اختلافات کوصرف حلقۂ درس یا فتویٰ یا تحقیقی رسائل تک محدود کر دیں' اور ان میں بھی لب ولہجہ قرآنی اصولِ دعوت کے مطابق نرم رکھیں۔ نقرے کسنے اور دوسرے کی توہین کرنے کو زہر سمجھیں۔ ہمارے پبلک جلسے' اخبار اور اشتہار بجائے باہمی آویزش کو ہوا دینے کے اسلام کے بنیادی اور متفق علیہ مسائل پر لگ جائیں تو پھر ہماری جنگ' جو فساد کی صورت اختیار کر چکی ہے' وہ دوبارہ جہاد میں تبدیل ہو جائے گی' اور اس کے نتیجے میں عوام کا رُخ بھی باہمی جنگ وجدل سے پھر کر دین کی صحیح خدمت کی طرف ہو جائے گا۔

صحیح اور غلط طرزِ عمل

بہت سے حضرات مسائل میں علماء کے اختلافات سے پریشان ہو کر پوچھا کرتے ہیں کہ ہم کدھر جائیں' جس کی تہہ میں یہ پوشیدہ ہوتا ہے کہ اب ہم کسی کی نہ سنیں' سب سے آزاد ہو کر جو سمجھ میں آئے کیا کریں۔ اور بہ ظاہر ان کا یہ معصومانہ سوال حق بجانب نظر آتا ہے' لیکن ذرا غور فرمائیں تو ان کو اس کا جواب اپنے گردوپیش کے معاملات میں خود ہی مل جائے گا۔ ایک صاحب بیمار ہوئے۔ ڈاکٹروں یا حکیموں کی آراء میں تشخیص و تجویز کے بارے میں اختلاف ہو گیا تو وہ کیا کرتے ہیں؟ یہی نا کہ وہ اُن ڈاکٹروں اور حکیموں کی ڈگریاں معلوم کر کے' یا پھر ان کے مطب میں علاج کرانے والے مریضوں سے یا دوسرے اہلِ تجربہ سے دریافت کر کے اپنے علاج کے لیے کسی ایک ڈاکٹر کو متعین کر لیتے ہیں۔ اسی کی تشخیص و تجویز پر عمل کرتے ہیں مگر دوسرے ڈاکٹروں اور حکیموں کو برا بھلا کہتے نہیں پھرتے۔ یہاں کسی کا یہ خیال نہیں ہوتا کہ معالجوں میں اختلاف ہے تو سب کو چھوڑو' اپنی آزاد رائے سے جو چاہو کرو۔ کیا یہی طرزِ عمل علماء کے اختلاف کے وقت نہیں کر سکتے؟

ایک مثال اور لیجیے! آپ کو ایک مقدمہ عدالت میں دائر کرنا ہے۔ قانون جاننے والے وکلاء سے مشورہ کیا۔ ان میں اختلافِ رائے ہوا تو کوئی آدمی یہ تجویز نہیں کرتا کہ مقدمہ دائر کرنا ہی چھوڑ دے' یا پھر کسی وکیل کی نہ سنے اور خود اپنی رائے سے جو سمجھ میں

آئے وہ کرے۔ بلکہ ہوتا یہی ہے کہ مختلف طریقوں سے ہر شخص اتنی تحقیق کر لیتا ہے کہ ان میں کون سا وکیل اچھا جاننے والا اور قابلِ اعتماد ہے' اس کو اپنا وکیل بنا لیتا ہے' اور دوسرے وکیل کو باوجود اختلاف کے دشمن نہیں سمجھتا' برا بھلا نہیں کہتا' اس سے لڑتا نہیں پھرتا۔

یہی فطری اور سہل اصول اختلافِ علماء کے وقت کیوں اختیار نہیں کیا جاتا؟ یہاں ایک بات یہ بھی سن لی جائے کہ بیماری اور مقدمے کے معاملات میں تو آپ نے کسی غلط ڈاکٹر یا غیر معتمد وکیل پر اعتماد کر کے اپنا معاملہ اس کے حوالے کر دیا تو اس کا جو نقصان پہنچتا ہے وہ ضرور آپ کو پہنچے گا' مگر علماء کے اختلاف میں اس نقصان کا بھی خطرہ نہیں۔

حدیث میں ہے کہ کسی شخص نے اگر کسی عالم سے سوال کیا اور اس نے فتویٰ غلط دے دیا تو اس کا گناہ سوال کرنے والے پر نہیں' بلکہ فتویٰ دینے والے پر ہے۔ شرط یہ ہے کہ سوال اس شخص سے کیا گیا ہو جس کا عالم ہونا آپ نے ایسی ہی تحقیق و جستجو کے ذریعے معلوم کیا ہو جو اچھے معالج اور اچھے وکیل کی تلاش میں آپ کیا کرتے ہیں۔ اپنی مقدور بھر صحیح عالم کی تلاش و جستجو کر کے آپ نے ان کے قول پر عمل کر لیا تو آپ اللہ کے نزدیک بری ہو گئے۔ اگر اس نے غلط بھی بتا دیا ہے تو آپ پر اس کا کوئی نقصان یا الزام نہیں۔ ہاں یہ نہ ہونا چاہیے کہ ڈاکٹر کی تلاش میں تو اس کا ایم بی ایس ہونا بھی معلوم کریں' اور یہ بھی کہ اس کے مطب میں کس طرح کے مریض زیادہ شفایاب ہوتے ہیں' مگر عالم کی تلاش میں صرف عمامے' کرتے اور داڑھی کو یا زیادہ سے زیادہ جلسے میں کچھ بول لینے کو معیار بنا لیں۔ اگر آپ نے ایسا کیا تو آپ اپنی ذمہ داری سے بری نہیں۔ اس نے جواب میں کوئی غلطی کی تو آپ بھی اس کے مجرم قرار پائیں گے۔

باہمی جنگ و جدال کے دو رُکن

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ آج مذہب کے نام پر جو جنگ و جدال کا بازار گرم ہے اس کے دو رکن ہیں۔ ایک ہر فرقہ اور جماعت کے علماء' دوسرے وہ عوام جو ان کے پیچھے چلنے والے ہیں۔ علماء اگر اپنی تحقیق و تنقید میں قرآنی اصولِ دعوت کے مطابق دوسرے کی

تنقیص و توہین سے پرہیز کرنے لگیں' اور اسلام کے وہ بنیادی مسائل جن میں کسی فرقے کو اختلاف نہیں اور اسلام اور مسلمانوں پر جو مصائب آج آ رہے ہیں وہ سب انہی مسائل سے متعلق ہیں' اپنی کوششوں اور محنتوں کا رُخ اس طرف پھیر دیں' اسی طرح عوام اپنی مقدور بھر پوری کوشش کر کے کسی صحیح عالم کا انتخاب کریں اور پھر اس کے بتائے طریقے پر چلتے رہیں' دوسرے علماء یا ان کے ماننے والوں سے لڑتے نہ پھریں' تو بتایئے کہ ان میں اشکال کیا ہے؟ سارے فرقے اور ان کے اختلافات بدستور رہتے ہوئے بھی یہ باہمی جنگ و جدل ختم ہو سکتا ہے' جس نے آج مسلمانوں کو کسی کام کا نہیں چھوڑا۔ صرف ذرا سی توجہ دینے اور دلانے اور طرزِ عمل بدلنے کی ضرورت ہے۔ کاش میری یہ آواز اُن بزرگوں اور دوستوں تک پہنچے جو اِس راہ میں کچھ کام کر سکتے ہیں' اور محض اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے نام پر اس ہمدردانہ دعوت کے لیے کھڑے ہو جائیں تو اُمت کی بہت سی مشکلات حل ہو جائیں' اور ہمارا پورا معاشرہ جن مہلک خرابیوں کی غار میں جا چکا ہے ان سے نجات مل جائے۔

عام سیاسی اور شخصی جھگڑوں کا علاج

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ مذہبی معاملات میں جس شخص نے کوئی خاص رُخ اختیار کر رکھا ہے' وہ اسی کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی تعلیم و تلقین سمجھ کر اختیار کیے ہوئے ہے' خواہ وہ حقیقت کے اعتبار سے بالکل غلط ہی ہو' مگر اس کا نظریہ کم از کم یہی ہے کہ وہ اللہ کا دین ہے۔ ان حالات میں اس کو ہمدردی اور نرمی سے اپنی جگہ افہام و تفہیم کی کوشش تو بجائے خود جاری رکھنا چاہیے' لیکن جب تک اس کا نظریہ نہ بدلے اس کو دعوت نہیں دی جا سکتی کہ تم ایثار کر کے اپنا نظریہ چھوڑ دو اور صلح کر لو۔ ان سے تو صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ اختلافِ رائے کو اپنی حدود کے اندر رکھیں اور افہام و تفہیم' قرآنی اصول وحکمت و موعظت اور مجادلہ بالتی ھی احسن کو نظر انداز نہ کریں۔ مگر جن معاملات کا تعلق صرف شخصی اور ذاتی حقوق اور خواہشات سے ہے' وہاں یہ معاملہ

سہل ہے کہ جھگڑے سے بچنے کے لیے دوسرے کے لیے اپنی جگہ چھوڑ دے' اپنے حق سے دستبردار ہو جائے۔ اور جو شخص ایسا کرے دنیا میں بھی اس کی عزت کو چار چاند لگ جاتے ہیں اور جس مقصد کو چھوڑا ہے وہ بھی دوسرے راستے سے حاصل ہو جاتا ہے' اور آخرت میں تو اس کے لیے ایک عظیم بشارت ہے جس کا بدل پوری دنیا اور دنیا کی ساری حکومتیں اور ثروتیں بھی نہیں ہو سکتیں۔ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: ((اَنَا زَعِيْمٌ بِبَيْتٍ فِيْ رَبَضِ الْجَنَّةِ لِمَنْ تَرَكَ الْمِرَاءَ وَاِنْ كَانَ مُحِقًّا))(۱) ''میں ضامن ہوں اُس شخص کو وسط جنت میں مکان دلانے کا جس نے حق پر ہونے کے باوجود جھگڑا چھوڑ دیا''۔

میں آخر میں پھر اپنے پہلے جملے کی طرف رجوع کرتا ہوں کہ ہماری ساری خرابیوں کی بنیاد قرآن کو چھوڑنا اور آپس میں لڑنا ہے اور یہ آپس کی لڑائی بھی درحقیقت قرآنی تعلیمات سے ناواقفیت یا غفلت ہی کا نتیجہ ہے۔ گروہی تعصبات نے یہ حقائق نظروں سے اوجھل کر رکھے ہیں۔ دنیا میں صالحین کی اگرچہ قلت ضرور ہے مگر فقدان نہیں۔ افسوس ہے کہ ایسے مصلحین کا سخت قحط ہے جو گردوپیش کے چھوٹے چھوٹے دائروں سے ذرا سر نکال کر باہر دیکھیں اور اسلام اور قرآن ان کو کس طرف بلا رہے ہیں' ان کی صدائیں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو دین کے راستے پر چلنے کی توفیق کامل عطا فرما دیں۔

اَللّٰهُمَّ وَفِّقْنَا لِمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰى مِنَ الْقَوْلِ وَالْفِعْلِ وَالْعَمَلِ وَالنِّيَّةِ وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ وَصَفْوَةِ رُسُلِهٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ۔

---

(۱) سنن ابی داوٗد' کتاب الادب' باب فی حسن الخلق۔

مرکزی **انجمن خدّام القرآن** لاہور

کے قیام کا مقصد

منبع ایمان — اور — سرچشمۂ یقین

قرآنِ حکیم

کے علم و حکمت کی

وسیع پیمانے — اور — اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ اُمتِ مسلمہ کے فہیم عنصر میں **تجدیدِ ایمان** کی ایک عمومی تحریک برپا ہو جائے

اور اس طرح

اسلام کی **نشاۃِ ثانیہ** — اور — **غلبۂ دینِ حق** کے دورِ ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ